ندا فاضلی کا تخلیقی سفر
سیفی سرونجی

ندا فاضلی کا تخلیقی سفر

مرتب

سیفی سرونجی

نام کتاب :- ندا فاضلی کا تخلیقی سفر
مصنف :- ڈاکٹر سیفی سرونجی
سنہ اشاعت :- ۲۰۱۰ء
قیمت :- Rs:200
کمپوزنگ :- محمد منیر ندوی
پرنٹرس :- اسٹار گرافکس اینڈ پرنٹرس، موبائل:9893857352
زیر اہتمام :- انتساب پبلی کیشنز
سیفی لائبریری سرونج (ایم۔پی)
Mb.9425641777

ملنے کے پتے
(کتاب دار)

Naya Waraq
post Box No.5030 Chinch Bunder
post Office.Mumbai.400 009
Sad bhavna Manch Sironj (M.P.)

فہرست

☆☆☆

سیفی سرونجی

اپنی بات

ندا فاضلی سے متعلق میرا یہ کام پچیس تیس سال پرانہ ہے، جب کہ وہ میرا ابتدائی دور تھا ظاہر ہے کہ پچیس تیس سال کے عرصے میں ندا فاضلی نے جو تخلیقی کام کیا ہے، اس پر میں تفصیل سے بحث نہیں کر سکا ہوں، اب تو ان کی نئ شعری اور نثری کتابیں منظر عام پر آ چکی ہیں، جن کا میں نے پہلے صفحات میں صرف تذکرہ کر دیا ہے، اس بات سے کون انکار کر سکتا ہے کہ ندا فاضلی اس عہد کے ان نمائندہ شعراء میں سب سے نمایاں ہیں، جنھوں نے اپنی منفرد شاعری اور منفرد نثر نگاری سے اردو زبان وادب کو اتنا کچھ دیا ہے کہ جس کی تفصیل کے لئے تو ایسے کئی مقالے لکھے جا سکتے ہیں اور لکھے جا رہے ہیں، ان پچیس تیس سالوں میں انھوں نے کئی شاہکار نظمیں، غزلیں، دوہے تخلیق کئے ہیں، ندا فاضلی نے اپنی ذہانتوں کو ہمیشہ بچائے رکھا ہے اور وقتاً فوقتاً وہ اپنی منفرد تحریروں میں انہیں پیش کرتے رہے ہیں، وہ ادب میں چھلانگ لگا کر ادب کے ہیرو بنا گوارہ نہیں کرتے، بلکہ اپنی صلاحیتوں کا دھیرے دھیرے استعمال کرتے رہتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ ادب کے سنجیدہ حلقوں میں ان کا نام احترام سے لیا جاتا ہے۔ ندا فاضلی کا تخلیقی سفر ابھی جاری ہے، پتہ نہیں اور کون سی ایسی تخلیق وہ ادب کو اور دیدیں ، جو کہ آئندہ ان پر تمام کام کرنے والوں کے لئے مشعل راہ ثابت ہوں۔

میری تمام پڑھنے والوں سے ہی یہی گذارش ہے کہ میرے اس مقالے کو آج کے تناظر میں نہ دیکھا جائے بلکہ ایک ادنیٰ طالب علم نے تیس سال پہلے کے ندا فاضلی سے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کیا تھا، وہ آج کس درجہ صحیح ثابت ہوئے ہیں۔

ندا فاضلی میرے بچپن ہی سے آئیڈیل رہے ہیں یہی وجہ ہے کہ جب میں نے ایم اے کیا تو پی ایچ ڈی کے لئے ندا فاضلی کی شخصیت اور فن کو اپنا موضوع بنایا اور کئی سال تک مسلسل ان پر کام کرتا رہا، کئی مرتبہ گوالیار گیا، ان کا وہ گھر دیکھا جو ایک ہی رات میں ان

سے چھن گیا تھا اور پوری رات ندا فاضلی نے سردی میں گھر سے باہر نئی سڑک پر کاٹی، وہ نیم کا پیڑ وہ رنجیت ہوٹل دیکھا جہاں اکثر ندا ٹھہرتے ہیں، وہ تاریخی بچ دیکھی جس پر بیٹھ کر ندا فاضلی نے کئی شاہکار نظمیں تخلیق کیں، گوالیار میں ندا فاضلی کے تمام دوستوں اور ملنے والوں سے بہت ہی معلومات حاصل کیں، خاص طور پر مکٹ بہاری سروج، شکیل گوالیاری، رؤف جاوید تو میرے ساتھ ساتھ رہے، کئی مرتبہ بمبئی گیا یہی نہیں ندا فاضلی کئی بار سرونج بھی تشریف لائے، ان کے ساتھ گھنٹوں بیٹھا، گفتگو سنی اور ان کے لطیفے وقہقہے سنے، جن کے اندر درد کا ایک سمندر چھپا ہوتا ہے، وہ باہر سے جتنے ہنس مکھ دکھائی دیتے ہیں، اتنے ہی اندر سے ٹوٹے ہوئے، ان کے ظاہری قہقہوں میں جھانک کر دیکھا تو معلوم ہوا، وہ صرف دیکھنے دکھانے کو ہنستے ہیں، جان بوجھ کر ایسی کوشش کرتے ہیں کہ ان کی شخصیت ایک دم کھل کر سامنے نہیں آتی، وہ ایک بڑے شاعر ہی نہیں ایک فلسفی ہیں، معلومات کا ان کے پاس ایک خزانہ ہے جو اکثر ان کے پاس بیٹھنے والوں پر لٹاتے رہتے ہیں، ان کی شخصیت کے کئی پہلو ہیں، وہ کسی پر ایک دم نہیں کھلتے، جب تک وہ اسے آزمانہ لیں، اپنی ذہانتیں اور علمی خزانہ ہر ایک پر نہیں لٹاتے، ان کی شخصیت علمیت ان کی شاعری میں دیکھی جا سکتی ہے، ندا فاضلی نے صحیح معنوں میں اپنی شاعری اور اپنی دیگر تخلیقات میں بہت کچھ پیش کر دیا ہے، پھر بھی انھوں نے اپنی مکمل صلاحیتوں اور ذہانتوں کو چھپا کر رکھا ہے، یہی کیا کم ہے کہ ندا نے اپنی ہر تخلیق ایک ایک لفظ میں اپنی تخلیقی قوتوں کو اجاگر کر دیا ہے، ایسے سینکڑوں الفاظ ہیں جو صرف ندا ہی کی دین ہیں، اس سے پہلے کسی شاعر نے ان الفاظ کو چھوا تک نہیں ہے، جنھیں ندا نے اپنی شاعری اور نثر میں استعمال کیا ہے۔ اس لئے یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ ندا نے اردو زبان وادب کو الفاظ کے ساتھ ساتھ نئے نئے خیالات اور موضوعات سے مالا مال کر دیا ہے۔ بلا شبہ وہ اس عہد کے ایک بڑے شاعر ہیں، جن پر آگے بہت کچھ لکھا جانا ہے اور دھیرے دھیرے ان کی شاعری اور شخصیت، صلاحیتیں اور ذہانتیں کھلتی جا رہی ہیں اور بہت جلد آنے والا وقت یہ ثابت کر دے گا کہ ندا ہی وہ شاعر ہیں جنھوں نے اپنی فلسفیانہ اور مفکرانہ شاعری میں ہندوستانی تہذیب کو زندہ جاوید بنا دیا ہے۔

☆☆☆

منفرد اسلوب کا بانی ندا فاضلی

عام طور پر نقاد یا تبصرہ کرنے والے حضرات بہت ہی دریا دلی کے ساتھ کسی بھی شاعر ادیب کو منفرد جدید لب ولہجہ اور نجانے کن کن القاب وآداب سے نوازتے رہتے ہیں کہ بے چارہ شاعر کہیں کا نہیں رہتا، اس لئے کہ وہ منفرد اور معتبر ہوتا ہی نہیں ہے کیوں کہ زیادہ تر لکھنے والے الفاظ کی مٹی پلید تو کرتے ہی ہیں، ساتھ میں اس شاعر ادیب کو بھی لے ڈوبتے ہیں، جس کے بارے میں زمین آسمان کے قلابے ملا کر اسے آسمان ادب کا روشن ستارہ ثابت کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اس لئے کہ ایسے مضامین منفرد جدید معتبر جیسے الفاظ لکھ تو دیئے جاتے ہیں لیکن ثابت نہیں کیا جاتا۔ لیکن ندا فاضلی نے شروع سے ہی اپنی انفرادیت کو نہ صرف قائم رکھا ہے، بلکہ اپنی شاعری اپنی منفرد نثر سے اردو زبان وادب کو نئے نئے خیالات اور نئے الفاظ، نئے اسلوب سے آشنا ہی نہیں ایک اضافہ کیا ہے، ادب کو بہت کچھ دیا ہے، وہ اپنے اسلوب کے خود بانی ہیں، جنھوں نے شاعری کی تو سب سے جدا اور نثر لکھی تو ایک مثال قائم کر دی۔ ''ملاقاتیں'' سے لیکر اپنی آپ بیتی ''دیواروں کے بیچ'' تک ندا نے اردو نثر کو ایک نئے اسلوب کے ساتھ پیش کر کے وہ معیار و وقار بخشا ہے کہ صدیوں لوگ ایسی نثر کے بانی پیدا نہیں ہوں گے۔ اسی طرح شاعری میں اپنی منکرانہ سوچ کے ساتھ ہندوستانی تہذیب کو زندہ رکھ کر ایک مثال قائم کی، یہی وجہ ہے کہ آج ندا فاضلی ایک معتبر جدید شاعر کی حیثیت سے دنیائے ادب میں ایک بلند مقام رکھتے ہیں، ان کے اس مقام و مرتبہ کو ساری ادبی دنیا نے نہ صرف تسلیم کیا ہے بلکہ اعتراف کیا ہے۔

ندا فاضلی کے والد مرتضی حسن علیگڑھ کے پاس ایک ایک ڈبائی نامی چھوٹے سے قصبے کے رہنے والے تھے، اسی مناسبت سے وہ اپنا تخلص ڈبا کے ساتھ دعا ڈبائیوں لگاتے ہیں، دعا ڈبائیوں ریلوے میں ایک اعلی عہدے پر فائز تھے، ان کی شادی دہلی کے ایک معزز گھرانے میں ہوئی تھی، بیوی کا نام جمیل فاطمہ تھا، ندا فاضلی کی پیدائش ۱۲/اکتوبر ۱۹۳۸ء کو دہلی میں ہوئی، ندا فاضلی کی ابتدائی تعلیم پرانے دستور کے مطابق گھر پر ہوئی قرآن اور دین تعلیم کے بعد ندا فاضلی نے پانچویں کلاس تک گوالیار کے مادھوگنج میں واقع اسکول میں پہنچے، تو وہاں کے ہیڈ ماسٹر ریاض الدین تھے، گویا ندا فاضلی کی زندگی سنوارنے اور ادبی ذوق کو نکھارنے والے سب سے اہم ماسٹر ریاض الدین تھے، جس کا ذکر خود ندا فاضلی نے اپنی خودنوشت "دیواروں کے بیچ" میں تفصیل سے کیا ہے۔ ندا لکھتے ہیں:

"چھٹی کلاس میں وی سی ہائی اسکول میں داخلہ ہوتا ہے، اس اسکول میں سیکنڈ ہیڈ ماسٹر ریاض الدین تھے، یہ وہی ریاض الدین ہیں، جن کی نظم پرارتھنا کے روپ میں ہر پرائمری اسکول میں دہرائی جاتی ہے، ماسٹر ریاض الدین ندا فاضلی کے والد کے دوستوں میں تھے، شاعر بھی تھے اور ریاض الدین جبوری کے نام سے شعر کہتے تھے، مشاعروں میں اپنا کلام سنانے سے پہلے تبرکاً اپنے استاد نوح ناروی کے دو تین شعر ضرور پڑھتے تھے۔"

ندا فاضلی کو شاعری وراثت میں ملی، گھر میں ادبی ماحول ہونے کی وجہ سے ندا بھی بچپن ہی سے شعر کہنے لگے، والد کے دوستوں میں بھی زیادہ تر شاعر تھے، جو اکثر ان کے کے گھر آتے جاتے رہے، محفلیں منعقد ہوتیں، اسی شعری ادبی ماحول میں ندا فاضلی کی تربیت ہوتی رہی اور اکثر والد صاحب کے ساتھ شعری نشستوں میں جاتے، اس سلسلے میں خود ندا فاضلی نے اپنی آپ بیتی میں بہت تفصیل سے ذکر کیا ہے۔

"گھر کے ادبی ماحول اور والد کے ساتھ شعری نشستوں میں شرکت نے ندا فاضلی میں بھی ادبی ذوق پیدا کر دیا تھا اور چھوٹی عمر میں ہی وزن میں

مصرع جوڑنے کی صلاحیت ظاہر ہونے لگی تھی، نصاب کی کتابوں سے زیادہ قافیوں کی تلاش میں وقت ضائع کرنے لگا ہے، یادداشت اتنی اچھی ہے کہ داغ، نوح اور اپنے والد کے بہت سے شعر یاد ہو گئے ہیں، انہیں کو الٹ پھیر کر شعر بنا لیتا ہے، گھر سے اسکول تک ریاض صاحب کے ساتھ جاتا ہے اور ہر روز راستے میں انہیں نئے شعر سناتا ہے، وہ چپتے رہتے تھے، داد بھی دیتے جاتے تھے اور ساتھ ہی اصلاح بھی دیتے جاتے تھے۔''

اب ظاہر ہے کہ جس بچے نے بچپن سے ہی ایسا ادبی ماحول پایا ہو، اٹھتے بیٹھتے چلتے پھرتے شعر و ادب کی گفتگو ہوتی ہو، اس کے بڑے شاعر ہونے میں کون سی بڑی بات ہوگی، ۱۹۶۰ء میں ندا فاضلی کا پورا کنبہ مع والدین کے گوالیار سے پاکستان کے لئے ہجرت کر گیا تھا، اس تاریخ سے ندا ہندوستان میں اپنے گھر کے اکیلے فرد رہ گئے تھے، گوالیار میں کمیونسٹ پارٹی کے دفتر میں رہنے لگے تھے، گھر والوں کے پاکستان چلے جانے کے بعد ان سے ان کا گھر بھی چھن گیا تھا، جس کا ذکر خود ندا فاضلی نے اپنی پہلی کتاب ''لفظوں کا پل'' کے دیباچے میں اشاروں کی زبان میں کیا ہے، ہندوستان میں تنہا رہ جانے کے بعد ندا فاضلی کے لئے روزی روٹی کا مسئلہ درپیش آیا، چند ماہ تک وہ بھگوت ساہب نائٹ کالج میں انگریزی پڑھانے کی خدمت انجام دینے لگے، لیکن ملازمت ان کے مزاج کو راس نہ آئی کیونکہ اس کے لئے بڑے بڑے عہدوں پر تقرر کے لئے کئی آفرس آتے رہے، مگر انھوں نے ملازمت کرنا قبول نہیں کیا، کیونکہ وہ اپنے آپ کو پوری طرح ادب کے لئے Sarranded کر چکے تھے اور انھوں نے اپنی زندگی کا نصب العین صرف ادب کو بنا لیا تھا، گوالیار میں ان کا ایک مخصوص حلقہ تھا، جس میں کالج کے پروفیسر اور کچھ طلبہ بھی تھے، ہمیشہ اپنے حلقہ احباب میں انگریزی ادب پر گفتگو کرنا ندا کا خاص موضوع تھا۔ جس زمانے میں ندا آزاد نظمیں کہہ رہے تھے یا اپنے وسیلہ اظہار کے لئے Frceverse کو اپنایا تھا، یہ شاعری گوالیار تو کیا پورے ملک میں عزت کی نظر سے نہیں دیکھی جاتی تھی، شاعری کی نئی

ڈگر کو اپنانا ندا کا یہ انقلابی جرأت مندانہ قدم بڑے حوصلے کا تھا انگریزی ادب انگریزی تاریخ کا غائر مطالعہ ندا پہلے ہی کر چکے تھے، ابتدائی زمانے میں ندا کے ذہن پر فرائڈ کا اثر زیادہ رہا، ندا فاضلی کا گوالیار میں یہ معمول تھا کہ رات دس بجے تک کمیونسٹ پارٹی کے اس کمرے میں لوٹ آتے تھے، جو ان کی قیام گاہ تھا اور رات بھر مطالعہ کرتے تھے، کبھی گھنٹے آدھے گھنٹے کے لئے آنکھ بھی لگ جاتی تھی مگر جاگتے ہی پھر پڑھنا شروع کر دیتے تھے، صبح اذان ہونے تک پڑھتے رہنا ان کا شغل تھا، دن میں نو دس بجے معمولی سا کھانا کھا کر تیسرے پہر تک سوتے تھے جاگنے کے بعد کمرے سے باہر چہل قدمی کے لئے نکل جاتے تھے، رات دس بجے تک اپنے پڑھے لکھے احباب کے بیچ ادبی بحث و مباحثہ میں مشغول رہتے تھے اور پھر شب کو وہی پڑھنے کا معمول صبح تک قائم رہتا تھا، روزانہ صبح تک جاگنے کے بعد ضروریات سے فارغ ہو کر صبح تڑکے ہی نئی سڑک پر پہلا ہوٹل اور پہلی پان کی گمٹھی جو ہمیشہ کھل جایا کرتی تھی، وہاں ایک پیالی چائے پی کر اور ایک عدد پان پنامہ سگریٹ لے کر گوالیار کے ایک سنسان مگر حسین علاقے میں شہر سے باہر نکل جاتے تھے، جہاں کٹورا تال کی پتھر کی بینچ پر بیٹھ کر آزاد نظموں کی فکر میں دھوپ نکلنے تک بیٹھے رہتے تھے اور لکھتے رہتے تھے، اس طرح ندا فاضلی کی زیادہ تر نظمیں جو ''لفظوں کا پل'' میں ہیں، وہ گوالیار کے کٹورا تال کی اسی پتھر کی بینچ کی یادگار ہیں، ندا فاضلی کے لئے رات بھر مطالعہ کرنا، پڑھے لکھے لوگوں میں بیٹھنا، ان سے گفتگو کرنا، ان سے بحث و مباحثہ کرنا روز کا معمول تھا اور ان کی اسی سخت جستجو اور شوق نے ان کی شخصیت کو جاذب نظر بنا دیا۔ زندگی کے یہ تلخ ایام ندا فاضلی نے کس طرح گذارے، یہ ان کی خودنوشت ''دیواروں کے بیچ'' پڑھ کر ہی اندازہ لگایا جا سکتا ہے، یہی وہ حالات تھے جو آگے چل کر ندا فاضلی کی شخصیت اور ان کی شاعری پر اتنے اثر انداز ہوئے کہ ہر جگہ نظموں غزلوں میں، گیتوں اور دوہوں میں نظر آنے لگے، ندا فاضلی اتنی پریشانیوں اور مصیبتوں کے باوجود ٹوٹے نہیں۔ بلکہ ہمت سے مقابلہ کیا اور برابر ترقی کی منزلیں طے کرتے رہے، ندا فاضلی نے اپنی زندگی میں بہت کچھ دیکھا سمجھا ہے اور جن جن

تجربات سے گزرے ہیں، وہ تجربات مشاہدات ان کی شاعری میں جگہ جگہ نظر آتے ہیں، یہ دن ندا فاضلی نے بڑی مشکلوں سے کاٹے اور حالات سے پریشان ہو کر ۱۹۶۵ء کے بعد ندا فاضلی مستقل طور پر بمبئی جا بسے۔

شروع شروع میں ندا فاضلی بمبئی میں بے حد پریشان رہے، جس زمانے میں ندا نے بمبئی میں قدم رکھا تھا، وہاں شکیل بدایونی، ساحر لدھیانوی، حسرت جے پوری، مجروح سلطان پوری، کیفی اعظمی، علی سردار جعفری اور اختر الایمان جیسے قد آور شاعروں کی دھوم تھی، ندا جس مقصد سے گئے تھے، وہ انھیں میسر نہ ہوا تو انھوں نے بمبئی میں اپنے قدم جمانے کے لئے بلٹز ہفتہ وار میں کالم لکھنا شروع کیا اور بمبئی کے ان تمام معتبر شاعروں پر مضامین لکھے، جو ملاقاتیں میں شامل ہیں، ندا کی اسی منفرد نثر اور بیباک مضامین نے ہی ندا کے قدم بمبئی میں جمائے اور وہ شعر و ادب کی تخلیق میں مصروف ہو گئے اور ترقی کی منزلیں طے کرنے لگے، اپنے ابتدائی دور کے متعلق عبد الاحد ساز سے گفتگو کرتے ہوئے وہ کہتے ہیں۔

> ''جب میں گوالیار سے بمبئی آیا تھا، اس وقت لفظوں کا پل نامکمل روپ میں تھا، اس میں قربتیں جو قصباتی زندگی کی دین ہوتی ہیں، لفظوں کی آہستہ روی اور تصویر گری میں نمایاں ہیں۔ مور ناچ کی غزلیں، نظمیں گیت، فاصلوں کی بستی بمبئی کی عطا ہیں۔ جہاں میں نے ایک طویل عرصہ بے روز گاری بے گھری اور بزرگ شاعروں کی ناراضگی کے عذاب میں گذارا تھا، ان حالات نے نہ صرف شعری موضوعات میں تبدیلی کا تقاضہ کیا، بلکہ اظہار کے پیرایوں میں ردو بدل کی ضرورت محسوس ہوئی، آنکھ اور خواب کے درمیان، بے گھری، بے روزگاری سے روزگار زندگی نے میرے وجود کے لئے تھوڑی بہت سہولتیں پیدا کرنی شروع کر دی تھیں '' ملاقاتیں '' سے پیدا شدہ ناراضگیوں میں بھی بڑی حد تک توازن پیدا ہوتا گیا تھا، ان دو مجموعوں کے

اسلوب وموضوع کا فرق میرے شب وروز کی تبدیلی کا فرق ہے، میرے خیال سے حالات یکساں واقعات کو نئی شکل میں دکھاتے رہتے ہیں، ہم اور معاشرہ وہی رہتا ہے لیکن دیکھنے والی نظریں اور محسوس کرنے والے زاویے بدلتے رہتے ہیں۔''

بمبئی میں قدم جمانے کے بعد ندا فاضلی نے مڑ کر نہیں دیکھا اور دن رات اپنے تخلیقی کاموں میں مصروف ہو گئے حد تو یہ ہے کہ فلمی دنیا کو بھی زیادہ اہمیت نہیں دی، اس طرح مضامین نظمیں غزلیں، گیت، دوہے تخلیق کرتے رہے، ندا فاضلی کے اس تخلیقی اور ارتقائی سفر کا جائزہ لیا جائے، تو نظم ونثر میں انھوں نے اپنے قلم کے وہ جوہر دکھائے ہیں کہ آج ان کا نام جدید شعراء کی فہرست میں سب سے اول نام رہے گا، اس لئے کہ انھوں نے صرف اچھی شاعری ہی نہیں کی بلکہ وہ منفرد نثر کے بانی بھی ہیں ''دیواروں کے بیچ'' اس کی زندہ مثال ہے، یہاں ندا فاضلی کے ارتقائی سفر اور ان کے تعارف کے طور پر ایک سال قبل شائع ہونے والے ''اعتراف'' کا ندا فاضلی نمبر سے تعارف پیش ہے۔

ندا ایک تعارف

نام: ندا فاضلی

پتہ: B/201 سن رائز آرام نگر 11 ورسوا اندھیری ویسٹ بمبئی 61

پیدائش: ۱۲/اکتوبر ۱۹۴۰ء گوالیار

تعلیم: ایم اے اردو ہندی وکرم یونیورسٹی اجین

کتابیں: شاعری اردو: لفظوں کا پل اشاعت اول ۱۹۷۱ء

لفظوں کا پل اشاعت دوم ۱۹۹۸ء

مور ناچ دسمبر ۱۹۷۸ء

آنکھ اور خواب کے درمیان ۱۹۹۶ء

شہر تو میرے ساتھ چل ۲۰۰۱ء

نثر اردو: ملاقاتیں (تنقید) ۱۹۸۶ء

دیواروں کے بیچ (ناول) ۱۹۸۶ء

دیواروں کے باہر (ناول) ۲۰۰۰ء

چہرے (مشاعرے کے شاعروں پر خاکے) ۲۰۰۲ء

شاعری ہندی: مورناچ

آنکھوں بھرا آکاش

کھویا ہوا سا کچھ

سفر میں دھوپ تو ہوگی

ہم قدم

ندا فاضلی کی شاعری - انتخاب و ترتیب: کے ایل نندن

گجراتی ترتیب: پیش لفظ داغ دہلوی، جگر مراد آبادی، جاں نثار اختر،

نریش کمار شاد، حسن نعیم، فراق گورکھپوری،

احمد فراز، محمد علوی، بشیر بدر، ندا فاضلی۔

اعزازات: غالب ایوارڈ: برائے ادب

ساہتیہ اکاڈمی ایوارڈ: برائے ''کھویا ہوا سا کچھ''

ایم پی شاسن ساہتیہ پریشد پرسکار: برائے ''ملاقاتیں''

جے دیال ہارمونی ایوارڈ: برائے شاعری دہلی

روئڑی ایکسینٹ ایوارڈ: برائے ادب

اسکرین ایوارڈ: بہترین نغموں کے لئے: برائے فلم ''سُر''

اس کے علاوہ اس ممتاز شاعر کی شاعرانہ صلاحیت کا اعتراف کرتے ہوئے مختلف ریاستوں مہاراشٹر، اتر پردیش، مدھیہ پردیش، آندھرا پردیش، راجستھان اور بہار نے ایوارڈ سے نوازا ہے۔

کئی فلموں میں گیت تحریر کئے اور فلمی دنیا کو کئی معیاری گیت دیئے۔ مختلف ٹی وی سیریل تحریر کئے اور ای ٹی وی کے پروگرام اردو بازار اور یو ٹی این کے شاعری پرگرام کی نظامت بھی فرمائی۔ ان کی شاعری کئی بین الاقوامی زبانوں میں ترجمہ ہو چکی ہے۔ آپ نے امریکہ، اٹلی، کنیڈا، آسٹریلیا، برطانیہ اور بوائے رئی میں ہندوستانی ادب کی نمائندگی کی ہے۔

ندا کی علمیت اور قابلیت کا لوہا تو ہر شخص نے تسلیم کیا ہی ہے اور یہ نہیں کہ ابھی تسلیم کیا ہو بلکہ ان کی ابتدائی شاعری سے ہی ان کی علمیت کی دھاک بیٹھ گئی تھی۔ ایک سچے اور بڑے تخلیق کار کی تخلیق میں جو خصوصیات ہوتی ہیں، وہ تمام خصوصیات ندا فاضلی کے پہلے شعری مجموعہ ''لفظوں کا پل'' میں ہی عیاں ہو چکی تھیں، شروع ہی سے ندا ایک بہت ہی ذہین شخصیت کا نام ہے، یہ ذہانتیں بہت کم شاعروں میں دیکھنے کو ملتی ہیں اور یہ ذہانتیں سب سے زیادہ اگر کسی شاعر میں پائی گئی ہیں تو وہ ہیں فراق گورکھپوری اور دوسرے ندا فاضلی۔ حالانکہ ندا فاضلی ہمیشہ اپنی ذہانتوں کو چھپاتے رہے ہیں، مگر کسی نے کہا ہے کہ صلاحیتیں چیختی ہیں اور تعریف کی بات یہ ہے کہ ندا نے کبھی اپنے بارے میں کسی قسم کا کوئی دعویٰ نہیں کیا، لیکن پھر بھی ان کی ذہانتیں چھپ نہیں پاتیں۔ کبھی ان کی گفتگو میں تو کبھی ان کی تحریروں میں کسی نہ کسی ذریعہ سے اجاگر ہوتی رہتی ہیں۔ وہ جب خاموش رہتے ہیں تو ایسا لگتا ہے کہ ایک سمندر ہے، جس پر سکوت چھایا ہوا ہے اور جب بولتے ہیں تو یوں لگتا ہے گویا علم کا ایک دریا بہہ رہا ہے، میں اکثر ان کی محفلوں میں بیٹھا ہوں اور گھنٹوں ان کی گفتگو سنی ہے، جن دنوں انتساب کا ندا فاضلی نمبر شائع ہوا تھا۔ اس موقع پر ندا کے گھر پر محمود ایوبی، شاہد ندیم، قیصر الجعفری اور دیگر احباب بیٹھے ہوئے تھے، ندا بہت ہی اچھے موڈ میں تھے، جس وقت انھوں نے بولنا شروع کیا تو ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ علم کا ایک خزانہ ہے، جو وہ لٹا رہے ہیں، ندا کی شاعری پر بے شمار نقادوں، ادیبوں نے لکھا ہے اور ہر زاویے سے ان کی شاعری کا جائزہ لیا ہے۔ یہاں کچھ مشاہیر کی رائے پیش کی جاتی ہے۔

وارث علوی

ندا کی شاعری کا سب سے بڑا وصف یہ ہے کہ ان میں پہلی بار بڑے شہر میں غریب الوطن شاعر کا پورا کرب، حیرانی، پریشانی کا اظہار ہوا ہے۔ میرا خیال ہے کہ جدید شاعروں میں کسی کے یہاں نگر کویتا کی اتنی اچھی اور رنگا رنگ کیفیات کی حامل شاعری کی مثال نہیں ملتی، جتنی کہ ندا کے یہاں، لیکن نگر کویتا کے لئے غزل کا دامن چھوٹا ہے، اس میں شہر کی وہ کیفیات پھیلاؤ، ہڑ بونگ گہما گہمی جھونپڑیاں اور گندگیاں آسمان بوس عمارتیں خوبصورت کشادہ راستے اور رات کو جھلملاتے قمقموں کی وہ لکیر نہیں جھلکتی، جو نظموں کو شہر کا عکس اور آئینہ بناتی ہے، ندا کے پاس ایک ایسی نظم ہے، جس میں شہر اپنے تضادات سے چور ایک کیفیت میں ڈوبا ہوا ملتا ہے، اس نظم کا عنوان ہے "میرا شہر"۔

یہی میرا شہر ہے جواب
بنا چھاؤں کے ناریل کے سہارے
جھکائے ہوئے سر کو بیٹھا ہوا ہے
اکیلا سا چپ چاپ سا ہمارا
کبھی یہ بھی
چاروں طرف بھاگتا تھا
بڑا زندہ دل تھا
یہ راتوں میں دن کی طرح جاگتا تھا
کبھی جین پہنے جوانوں کے جیسا
کبھی چلتی لوکل میں گاؤں کے جیسا
کبھی آرتی اور اذانوں کے جیسا
کبھی دور کے آسمانوں کے جیسا

صدا اس کی چاروں طرف گونجتی تھی
کھنکتا ہوا ایسا کلدار تھا وہ
خود اپنی ہی مستی میں سرشار تھا وہ
نظر لگ گئی اس کو شاید کسی کی
کبھی اس کی جیبوں میں ڈھیروں ہنسی تھی
یہ ہنستا بہت تھا

بشر نواز

ندا کی ابتدائی شاعری میں قصباتی معصومیت اور سادگی ملتی ہے، بڑے شہر میں آنے کے بعد ایسی سادگی کا تصادم یہاں کے تجارتی تعلقات اور اس سے پیدا ہونے والی ریاکاری سے ہوتا ہے، جس کے نتیجے میں ندا کے یہاں جھنجلاہٹ اور ہر چیز سے لڑ جانے کا انداز جنم لیتا ہے، لیکن ٹھوکر سے اجالا کشید کرنے کے شعور میں پھر ایک نئی دنیا کی جھلک دکھائی دیتی ہے، جس میں سبھی ایک درد کے مارے ہیں، تضادات دکھ درد یہاں بھی ہیں لیکن یہ کسی ایک فرد کا المیہ نہیں ہے، اسے ندا نے اپنی پوری سوجھ بوجھ سے اپنے المیہ کو پورے معاشرے کا المیہ بنا دیا ہے۔"

انور خان

"گھریلو رشتے گھر آنگن ہندوستانی مزاج وموسم کا عکس ندا کی شاعری کی اہم خصوصیات ہیں مگر اس سے بھی اہم عنصر جو انہیں اپنے نوع کے دوسرے شاعروں سے الگ کر دیتا ہے، وہ ہے ان کی شاعری میں آج کے عہد کے انسان کی ذہنی کش مکش کا بھرپور اظہار، شاید وہ بھی اور بہت سے شاعروں کی طرح اپنے بنائے ہوئے دائروں میں محصور ہو جاتے، مگر بمبئی شہر کی ہنگامہ خیز پرآشوب زندگی نے انہیں ایک بڑے تجربے سے دوچار کیا، ہلکی پھلکی رومانی

نظموں سے وہ اب انسان کو درپیش ذہنی روحانی مسائل پر آ گئے، اپنے عہد کی حشر سامانی کو انھوں نے محسوس بھی کیا اور اس کا اظہار بھی کیا، اس تجربے نے انھیں اپنے معاصر شاعروں سے بھی مختلف کر دیا، ندا کی شاعری آج کے ناقابل برداشت عہد میں ایک ذہین انسان کی اپنے پورے ہوش و حواس و ادراک کے ساتھ زیست کرنے کی کوشش کی ہے، وہ منیر نیازی کی طرح فطرت کے اسرار کا شیدائی نہیں وہ ناصر کاظمی کی طرح ماضی کے بسیروں میں جینے کا قائل ہے، بڑے شہروں کے مسائل بے چہرگی تنہائی کا احساس مجلسی اخلاق اور ریا کاریاں منافقتیں اور سماجی تحفظات ان سب سے گھبرا کر وہ کوئی خیالی دنیا نہیں بساتا۔"

مقدر حمید

ندا کی شعری تخلیقات گیت، دوہے، نظمیں، غزلیں ادب کے سنجیدہ قارئین کو متوجہ کرتی رہی ہیں۔ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ ان کی شاعری مسلسل موضوع بحث رہی اور اردو ہندی دونوں زبانوں میں اپنا اعتبار قائم کیا، لیکن جس نے پڑھنے والوں کو چونکایا وہ "ملاقاتیں" کی نثر تھی، کردار نگاری کے اس انداز نے جو تعظیم و تکریم کے چبوتروں پر ایستادہ بتوں کو زمین پر لا کر ان کے مکھوٹے اتار کر بشریت کے چہرے عطا کرتا آدمی آدمی کی نظر سے اپنی تمام خوبیوں، خامیوں، برائیوں اور کوتاہیوں سمیت دیکھنے اور دکھانے کے عمل کا امین تھا، ادب میں تخلیق اور تخلیق کار کو سمجھنے اور پرکھنے کی شمولیت بخشی اور حقائق کو عقیدتوں، مصلحتوں اور مصالحتوں کے حصار سے اوپر اٹھ کر دیکھا اور دکھایا، اس طرح صحیح تناظر میں افہام و تفہیم کی فضا سازی کا جواز پیدا کیا، یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ "ملاقاتیں" کو تخلیقی خاکہ نگاری میں سنگ میل کی حیثیت حاصل ہوئی اور خوب پذیرائی کی گئی، ادھر بعد کی نثری تخلیقات میں "دیواروں کے بیچ" اور "دیواروں کے باہر" دونوں نئے انداز کے سوانحی ناول ہیں، جن میں ندا ہوتے

ہوئے بھی نہیں ہیں اور جہاں جہاں جتنے ہیں، وہاں عہد وادوار واقعات وکردار کے حوالے سے ہیں، زبانی ربط وتسلسل کی غیر ضروری قیود سے آزاد ایک پورا عہد چیدہ چیدہ ان نثری تخلیقات میں تصویر ہوا ہے۔''

اس میں کوئی شک نہیں کہ ندا فاضلی کی نثر ہو یا نظم ان کے یہاں ان کا اسلوب سب سے اہم اور منفرد ہے، جو انہیں ان کے دوسرے ہم عصروں سے جدا کرتا ہے اور یہ بات تسلیم کرنی پڑتی ہے کہ وہ اپنے اسلوب کے خود بانی ہیں، دوہے، گیت، نظم ونثر ان کی ہر تحریر میں انفرادیت کے ساتھ ساتھ ہندوستانی تہذیب کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے، فراق کے بعد ندا پہلے واحد شاعر ہیں، جنھوں نے اپنی شاعری اور نثر میں ایک زبردست انفرادیت پیدا کر کے ادبی دنیا میں اس مقام ومرتبہ پر فائز ہوئے۔

☆☆☆

ندا فاضلی کی نظمیں

اس سے پہلے کہ ندا فاضلی کی نظموں کے بارے میں تفصیل سے ذکر کیا جائے نظم کے آغاز اور ارتقاء پر ایک نظر ضروری ہے ڈاکٹر محمد حسن لکھتے ہیں:

''اردو ادب پر ۱۹۳۶ء سے ۱۹۷۰ء تک لگ بھگ ترقی پسند تحریک کی حکمرانی رہی آخر آخر میں اس کی کیفیت یہ ہوگئی تھی کہ موضوعات اور پیرایہ بیان مقید ہو کر رہ گئے تھے، پھر ۱۹۶۰ء کے بعد ایک نیا ادبی مزاج ابھرنے لگا، جس کے کئی روپ تھے، ایک روپ وہ بھی تھا جس نے ترقی پسندی کی خطیبانہ لہجے اور ہنگامی موضوعات سے انحراف کے جوش میں اتنی دور نکل گئے کہ ادب کی سماجی ذمہ داری سے ہی انکار کر بیٹھے اور ''معصیت'' سے دامن باندھنے لگے، ۱۹۶۷ء کے لگ بھگ مشن اور فارمولے سے بھی نکلنے والے آجز آنے لگے اور عجلت اور تنہائی وجود کی کھوکھلی علامت پرستی اور ریت وصحرا، ٹوٹا ہوا آدھی اور کالی پیلی نظموں سے تنگ آ گئے نتیجہ کے طور پر نئی آواز کی تلاش شروع ہوئی۔

اور ظاہر ہے کہ یہ نئی آواز جدیدیت کے روپ میں سامنے آئی، یہ بات سچ ہے کہ ترقی پسند ادب نے تو بہترین شاعر بھی دئے ہیں، جو آج اردو ادب کے پلر ہیں، ابھی جدید ادب نے ایسا کوئی کارنامہ انجام نہیں دیا، بہر حال اس نئی تحریک اور جدیدیت کے رجحان کو اردو نظم نے زیادہ سے زیادہ قبول کیا ہے، اور نئے نام ابھر کر آئے ہیں مثلاً شہریار ،محمد علوی، ندا فاضلی، باقر مہندی، زبیر رضوی وغیرہ۔ ندا فاضلی جدید شعراء کی فہرست میں

اس لئے اہم ہیں کہ عوام ترقی پسندی کے خطیبانہ لہجے، بندھے ٹکے موضوعات، فیشن اور فارمولے سے اکتا گئے تھے کم ازکم ندا فاضلی نے ان تمام باتوں سے اپنے آپ کو شروع سے ہی دور رکھا۔

لیکن یہاں ہمارا مقصد نظم کی تاریخ لکھنا نہیں بلکہ ندا فاضلی کی نظموں کا جائزہ لینا ہے، ندا فاضلی کی شاعری کی ابتدا نظم سے ہوئی یہ بات الگ ہے کہ ندا فاضلی نظم سے ہو کر غزل گیت اور دوہے تک پہنچے، لیکن نظم ان کا مخصوص میدان رہا ہے''نظموں کا پل'' شاہد ہے ان کی ابتدائی نظمیں جنسی محرومیوں کے اظہار پر مبنی ہیں، حالانکہ دیہاتی زندگی شہری زندگی اور فسادات جیسے موضوعات پر بھی بہت سی نظمیں ہیں، جو ان کے پہلے مجموعے''لفظوں کا پل ''میں شامل ہیں، ندا فاضلی نے کسی مخصوص موضوع زندگی تک اپنے آپ کو محدود نہیں رکھا۔ مختلف موضوعات پر ان کی نظمیں یہاں پیش کی جاتی ہیں، جن میں زبان ولہجہ فکر کی گہرائی نمایاں طور پر نظر آتی ہے۔

جنسیات ''دو کھڑکیاں''

آمنے سامنے دو نئی کھڑکیاں
جلتی سگریٹ کی لہراتی آواز میں
سوئی ڈورے کے رنگین الفاظ میں
مشورہ کر رہی ہیں کئی روز سے
شاید اب
بوڑھے دروازے سے سر جوڑ کر
وقت کی بات کو وقت پر مان لیں
بیچ کی ٹوٹی پھوٹی گلی چھوڑ کر
کھڑکیوں کے اشارے کو پہچان لیں

نظم کے تاریخی ارتقاء کے متعلق ڈاکٹر محمد حسن اپنی کتاب ''ادبی سماجیات'' میں رقم طراز ہیں:

''نظم حالی کی مسدس سے سفر کرتی ہوئی رفتہ رفتہ چکبست اور اقبال تک پہنچی، جس کے بعد جوش اور اختر شیرانی کی ....اور ترقی پسند شاعروں کی سماجی معنویت نے اسے ایک نیا رخ دیا۔

طرز اسلوب کے اعتبار سے تخیل جذبہ اور فکر نے اس نئی صنف کے زمین و آسمان بدل ڈالے اور اختر الایمان تک پہنچتے پہنچتے اس میں ایک نیا بہار جھلکنے لگا، اسی نئی بہار کی طرف مختصراً اشارہ کیا جا سکتا ہے، حالی اور آزاد کے دور میں نظم کے محض تسلسل پر اصرار تھا، عام طور پر کسی ایک موضوع کو مختلف سیاق سباق میں پیش کرنا ہی کافی سمجھا جاتا تھا مثلاً حب الوطنی پرندوں میں کس طرح پائی جاتی ہے اور انسانوں میں اس کا کیا روپ ہے اور پھر انسانوں کے مختلف طبقوں میں اس کی کیا نوعیت ہے گویا ایک طرح کا منظوم انشائیہ یا Essay بن کر رہ جاتی ہے، چونکہ زور بیانی پر زیادہ توجہ ہے اور بیان مشاہدہ نظم ہے اور تخیل کی مدد سے مختلف مشاہدات کی فراہمی پر زیادہ توجہ ہے، نظم میں کیفیت اور احساس تعمیر بنیادی جگہ حاصل نہیں کرتے، بلکہ ان کے بجائے نظم چاروں طرف بکھری ہوئی زندگی کا ایک حصہ بن کر ابھرتی ہے۔

ایک اور نظم دیکھئے

بے خواب نیند

نہ جانے کوئی وہ بہروپیہ ہے

جو ہر شب ....

میری تھکی ہوئی پلکوں کی سبز چھاؤں میں

طرح طرح کے کرشمے دکھایا کرتا ہے

لپکتی سرخ لپٹ
جھومتی ہوئی ڈالی
چمکتے تال کے پانی میں ڈوبتا پتھر
ابلتے پھیلتے گھیروں میں تیرتے خنجر
اچھلتی گیند ربڑ کی سدھے ہوئے دو ہاتھ
سلگتے کھیت کی مٹی پہ ٹوٹتی برسات
عجیب خواب ہیں یہ........
بنا وضو کئے سوئی نہیں کبھی میں تو
میں سوچتی ہوں کسی روز اپنی بھابی کی
چمکتے پاؤں کی پازیب توڑ کر رکھ دوں
بڑی شریر ہے ہر وقت شور کرتی ہے
کسی طرح سہی بیخواب نیند تو آئے
گھڑی گھڑی کی مصیبت سے جان چھوٹ جائے

ندا فاضلی ''لفظوں کے پل''، ''مورناچ'' اور مورناچ سے ''آنکھ اور خواب'' کے درمیان تک کا سفر مختلف اصناف سخن کے ذریعہ کرتے رہے ہیں۔ لیکن ''لفظوں کے پل'' سے ''آنکھ اور خواب'' کے درمیان کے اس طویل سفر میں ان کی محبوب صنف سخن نظم ہی رہی ہے یہ بات الگ ہے کہ عمر کے ساتھ ساتھ مطالعہ کا تجربہ اور مشاہدہ نئی نظموں میں شامل ہوتا رہا ہے یہی وجہ ہے کہ ندا فاضلی، اختر الایمان کے بعد اپنے ہم عصروں میں کامیاب اور بڑے شاعر دکھائی دیتے ہیں، کچھ اور کامیاب اور مقبول عام نظمیں یہاں دی جا رہی ہیں۔

چوتھا آدمی

بیٹھے بیٹھے یوں ہی قلم لے کر
میں نے کاغذ کے ایک کونے پر

اپنی ماں........

اپنے باپ کے دو نام

ایک گھیرا بنا کے کاٹ دیے

اور

اس گول دائرے کے قریب

اپنا چھوٹا سا نام ٹانک دیا

میرے اٹھتے ہی میرے بچے نے

پورے کاغذ کو پھاڑ دیا

ندا فاضلی کی وہ مشہور نظم ہے جو نصاب میں بھی شامل ہے۔ ندا فاضلی نے زندگی کے مختلف پہلوؤں پر بے شمار نظمیں کہی ہیں، مثلاً..... گھر، الجھن، فطرت کے مناظر وغیرہ ڈاکٹر محمد حسن لکھتے ہیں:

"ندا فاضلی نے ذات کے اظہار پر تبدیلی کی خواہش صنعتی دور کے .... اور شعریت، نے پیکر تلاش کرنے کی کوشش کی اور اردو نظم کو اور جدید فضا سے آشنا کرایا، ندا نے اختر الایمان سے لے کر باقر تک سب سے اثرات قبول کئے ہیں، لیکن ان اثرات پر قناعت نہیں کی، ان کو اپنی انفرادیت میں ڈھال کر نیا رنگ آہنگ عطا کیا ہے۔"

صنعتی دور کے شہروں کے اعصاب شکن زندگی کی ایسی بھرپور تصویریں ندا کے علاوہ شاید ان کے کسی معاصر کے کلام میں ملیں، ایک نظم دیکھئے جس میں ندا نے یہ بتایا کہ عبادت صرف نماز پڑھنا، روزے رکھنا، کعبہ و سومنا تھ جانا ہی نہیں ہے بلکہ یہ بھی ہے۔

گھاس پر کھیلتا ہے اک بچہ

پاس بیٹھی ماں مسکراتی ہے

مجھکو حیرت ہے جانے کیوں دنیا
کعبہ و سومنات جاتی ہے

مہندی لگے ہاتھوں میں توے کی کالونچ
آنکھوں کے ہرن قید میں گھبراتے ہیں

روتے ہوئے بچے پر نظر پڑتے ہی
چولی کے کئی ٹانکے ادھڑ جاتے ہیں

مظفر حنفی نئی نظم کی رفتار و ترقی کا جائزہ لیتے ہوئے لکھتے ہیں:

''پچھلی دہائی کی رفتار کا جائزہ لیتا ہوں تو محسوس ہوتا ہے کہ ۱۹۷۱ء کے بعد منظر عام پر آنے والے متعدد غزل گو ایسے ہیں، جنھوں نے نئی غزل کو تازہ خون دے کر جہتوں سے آشنا کیا ہے، نئی کہانی کو بھی بہت سے افسانہ نگار اس دہائی کے عطا کئے ہیں لیکن نئی نظم کے بارے میں ایسی کوئی بات نہیں کہی جاسکتی۔ بلراج کومل، عمیق حنفی، کمار پاشی، قاضی سلیم، ندا فاضلی، وحید اختر اور نئی نظم کے پیش رو نئی نسل کے بہت سے فنکاروں کے یہاں تخلیقی تکان کے آثار نظر آرہے ہیں اور قافلے میں ایسے شعراء کا بہت کم اضافہ ہو رہا ہے، جن کے اخلاق اور شعری قوت سے توقع کی جاسکتی ہے کہ وہ نئی غزلوں کی خبر لائیں گے۔''

بلاشبہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ ان نئی غزلوں کی خبر لانے والوں میں جو اہم نام ہے وہ ندا فاضلی کا ہے، ندا فاضلی اپنی منفرد آواز کے ذریعہ اردو ادب میں ایک نمایاں مقام حاصل کرتے جارہے ہیں اور بہت جلد وقت یہ ثابت کردے گا کہ ندا ہی وہ شاعر ہیں جو سمندر سے گوہر تلاش کرنے میں کامیاب ہوئے اس کی وجہ ہے کہ ندا نے اردو نظم کو ایک نیا موڑ دیا

سماج میں بگڑے ہوئے چہروں کو ایک آئینہ دکھایا ہے۔

اختر الایمان نے ''بیتے لمحات'' کے دیباچے میں لکھا ہے:

''طرح طرح کی سماجی بے انصافیاں ہوتی رہتی ہیں، مگر ہم اس طرح چپ رہتے ہیں جیسے ہم ور پردہ ان بے انصافیوں کے حق میں ہیں، ان کے حامی ہیں، جب کہ ایسا نہیں ہے، یہی خاموشی ہمارے لئے بوجھ بن جاتی ہے کیوں کہ اچھا شاعر بنیادی طور پر دیانت دار ہوتا ہے، اس لئے اعصاب پر دباؤ پڑنے لگتا ہے اور ہم اسی کیفیت میں مبتلا ہو جاتے ہیں، جو آج عام ہے، ہم جو ترسیل کے المیہ کا رونا روتے ہیں اس کی وجہ بھی ہماری اپنی ذات اور سماجی زندگی سے دوری ہے، ظاہر ہے جب ہماری زندگی کی اتھل پتھل میں کوئی حصہ نہیں ہوگا، کسی چیز سے ہمارا کوئی تعلق خاطر اور جذباتی لگاؤ نہیں ہوگا، محبت نہیں ہوگی ہم دوسروں کے لئے اور دوسرے ہمارے لئے اجنبی ہوں گے، اس صورت میں ہم جو کہیں گے حرف نا آشنا اور ہمارا اظہار چیستاں ہوگا۔''

ندا فاضلی نے ان تمام باتوں کو محسوس کیا اور سماج میں ہونے والی ناانصافیوں کو دیکھا اور مشاہدہ کرتے رہے اور ان سے یہ سب خاموشی سے نہ دیکھا گیا اور کسی نہ کسی طریقے سے اس کا اظہار کرتے رہے، کبھی شعروں میں اور کبھی نظموں میں کبھی اپنی تقریروں میں اور ایک حساس شاعر کا جو فرض بنتا ہے وہ انھوں نے ادا کیا۔

لب ولہجہ کا شاعری میں ایک اہم رول ہوتا ہے، شاعروں کی بھیڑ عام طور پر کتابی لہجہ تقلیدی طرز اظہار پر گامزن دکھائی دیتی ہے، بہت کم شاعر ایسے ہوتے ہیں اور ہوئے ہیں جن کے بطن سے شعر پھوٹتے ہیں اور ان اشعار کا لب ولہجہ نہ تو تقلیدی ہوتا ہے اور نہ ہی تخلیقی بلکہ ہر نئے موضوع پر بتوں سے پھوٹنے والے چشموں کی طرح شاعر کے بطن سے نکلتا ہے۔ اپنا انداز اپنا رنگ اور اپنا لہجہ خود ساتھ لے کر آتا ہے ایسی ہی شاعری فطری شاعری کہلاتی ہے اور ایسا ہی شاعر فطری شاعر کہلاتا ہے، لب ولہجہ جو زبان کا مرہون منت

ہوتا ہے، زبان سے متعلق وارث علوی کا یقین ہے کہ ''زبان ایک نٹ کھٹ اور ضدی ہے، اسے رام کرنے میں شاعر کا حواس کا کی حیثیت کھونے میں اس کا اعجاز رہا ہے، اسی لئے زبان رخسار شاعر کے بوسوں کے نشانات ہی نہیں بلکہ ناخونوں کی خراش بھی ہوتی ہے۔''

ندا فاضلی کا لب ولہجہ متحرک تازہ نیا اور کبھی نہ مرنے والی آواز ہے۔ جوان کی زندگی میں سے چشمے کی طرح پھوٹتی ہے، ایک نظم دیکھیے۔

لگاؤ

دیکھتے دیکھتے ٹی وی فرج صوفہ بن کے
آدمی کھو گیا عزت کا تماشا بن کے
گھڑی گھڑی بھاگتے رہنا ہے مقدر اس کا
گھر کی دیواروں نے چھین لیا گھر اس کا

''دور کا ستارہ''

میں برسوں بعد
اپنے گھر کو تلاش کرتا ہوا، اپنے گھر پہنچا
لیکن اب میرے گھر میں، میرا گھر نہیں تھا
مجھے کافی دیر ہو گئی تھی ....

دیر ہو جانے پر..............
ہر کھویا ہوا گھر.............
آسمان کا ستارہ بن جاتا ہے
جو دور سے بلاتا ہے......
لیکن پاس نہیں آتا ہے..

☆

بقول مشتاق مومن '' آرٹ کی بنیاد تجربات محسوسات پر ہے نہ کہ منقولات اور

معقولات پر" ندا فاضلی کے یہاں خیال اور سوچ کی کوئی ایک لہر نہیں ہے، جس پر انگلی رکھ کر کہہ سکیں، یہی خالص اور سوچ من پسند رنگ ہے۔ وہ کسی خیال اور احساس کو بیان کرتے ہیں اور پھر اسے رد کرنے میں کوئی عار بھی نہیں محسوس کرتے اور پھر اپنا تجزیہ کرتے ہیں۔ ان کی ایک نظم "سنسار" ملاحظہ فرمایئے۔

سنسار

پھیلتی دھرتی
کھلا آکاش تھا
میں.....
چاند، سورج، کہکشاں، کہسار، بادل
لہلہاتی وادیاں سنسان جنگل
میں ہی میں
پھیلا ہوا تھا ہر دشا میں
جیسے جیسے بڑھتا جا رہا ہوں
ٹوٹتا مڑتا سکڑتا جا رہا ہوں
کل زمیں سے آسماں تک میں ہی میں تھا
آج.....
ایک چھوٹا سا کمرہ رہ گیا ہوں

ندا کے نئے لب لہجے کی ایک خاص وجہ اور بھی ہے کہ ان کو ہندی والوں کا سرکل ابتدا ہی سے ملا یا یوں کہیئے کہ ندا اپنے طالب علمی کے زمانے میں ہی ہندی والوں میں Move ہوئے، اس طرح ہندی لب ولہجے اور اردو کی منجھی ہوئی جدید زبان کے خوبصورت امتزاج نے ندا کے لب ولہجے کو ایک نیا رنگ دیا، جو ان کے گیتوں میں زیادہ نمایاں ہے۔

نیل گگن

بادل کے ٹکڑے- کیا کیا روپ بنائیں
اڑتا آنچل کھلتا جوڑا- ننھی ننھی باہیں

جلتا چولھا بھری کڑاہی
بنی بجی برسات

تجھ بن مجھ کو
بھور بھئی

بستی کے اندر گھس آیا ویرانہ
دھرتی پر ریکھائیں پھیلیں

کھڑی ہوئی دیواریں
سرحد سرحد چلے سپاہی
چمک اٹھیں تلواریں

کوئی لڑے بیوی بچوں سے
کوئی لکھے افسانہ

اس طرح ندا کی نظمیں غزلیں اور گیتوں میں ہندی لب ولہجے کا اثر غالب ہے مشتاق مومن ایک اور جگہ رقمطراز ہیں:

"یہ صحیح ہے کہ ندا کی شاعری میں استحکام ہے لیکن یہ بھی ہے کہ ان کی

بہت سی نظمیں صرف Stetment بہت سی مشہور نظمیں فارسی اور دوسری زبانوں کے اقوالِ زریں سے ماخوذ ہیں، مگر بحث کا یہ دوسرا رخ ہے جسے میں دوسروں پر چھوڑتا ہوں، ان کے فن پر لکھنا ایک الگ اور مستقل موضوع ہے جو ایک مستقل مقالے کا طلبگار ہے، سردست ندا فاضلی کی اب تک کی شاعری کا ایک تاثراتی جائزہ لینا مقصود تھا۔

مذہبی اور نسلی نفرت کا لاوا ریلوے انجن کے بوائر کی طرح اندر ہی اندر کھولتا رہتا ہے، جو موقع پاتے ہی پھٹ پڑتا ہے اور اپنے ساتھ سب کچھ بہا کر لے جاتا ہے، علاقائی تعصب اور فرقہ وارانہ فسادات آج طرز زندگی بن گئے ہیں آج فسادات اور جنگ پر جو نظمیں کہی جا رہی ہیں، ان میں ندا کی ایک الگ انداز رکھتی ہیں اور کئی لحاظ سے وہ ان نظموں اور افسانوں سے الگ ہیں جو تقسیم وطن کے بعد لکھی گئیں تھیں، ندا کا موضوع فساد ہو یا جنگ یا دو ملکوں کے میل ونہار، ان کا ایک الگ انداز اور الگ Treetment ہے۔ یہ نظمیں آج کے دور کے مزاج کا آئینہ دار ہیں، اپنے پیش روؤں کی طرح انہوں نے سرحد کو مان کر قبول کر کے شاعری نہیں کی بلکہ انھوں نے سرے سے اس سرحد کو ہی نہیں مانا ہے، جو جسموں پر سے گذار دی گئی ہے، اس سرحد پر وہ آدھے ادھر ہیں آدھے ادھر۔''

پاسپورٹ آفیسر کے نام ان کی نظم کا اقتباس دیکھئے۔

کراچی ایک ماں ہے
بمبئی بچھڑا ہوا بیٹا
یہ رشتہ پیار کا پاکیزہ رشتہ ہے جسے
ابتک
نہ کوئی توڑ پایا ہے
نہ کوئی توڑ سکتا ہے

غلط ہے ریڈیو، جھوٹی ہیں سب اخبار کی خبریں
نہ میری ماں کبھی تلوار تانے رن میں آئی ہے
نہ میں نے اپنی ماں کے سامنے بندوق اٹھائی ہے
یہ کیسا شور و ہنگامہ ہے
یہ کیسی لڑائی ہے

اور اس طرح جنگ پر ایک نظم ہے جس کا اقتباس درج ذیل ہے۔

جنگ

ہر گلی کوچے میں گھس کر
بند دروازوں کی سانکل کھولتی ہے
مدتوں تک
جنگ
گھر گھر بولتی ہے
سرحد پر فتح کا اعلان ہو جانے کے بعد

ندا فاضلی نے زندگی کے تمام پلوؤں پر نظمیں لکھی اور نئے نئے تجربات شاید ان کی شاعری میں خاص طور پر نظموں میں پائے جاتے ہیں۔ آج وہ ایک اہم اور بڑے نظم نگاروں میں شمار کئے جاتے ہیں، شروع میں انھوں نے نظم کی طرف زیادہ دھیان دیا بلکہ اپنی شاعری کی ابتدا ہی نظم سے کی یہی وجہ ہے کہ ندا فاضلی کی غزلوں کے مقابلے میں نظموں میں زیادہ گہرائی پائی جاتی ہے۔ یہ بات بارہا لکھی جا چکی ہے کہ ہماری اردو شاعری کا بیشتر سرمایہ غزل پر مشتمل ہے۔ بلراج کومل لکھتے ہیں:

''اردو شاعری کا بیشتر سرمایہ غزل پر مشتمل ہے اور اردو غزل کا نظم وضبط کچھ اس انداز کا ہے کہ اس کے اندر رہتے ہوئے تجربات کی گنجائش پیدا کرنا آسان کام نہیں، اس لئے ہمارے اکثر شاعر غالب کی طرح وسعت بیان

کی آرزو تو کرتے ہیں لیکن اکثر و بیشتر اپنے آپ کو غزل کی تزئین کاری تک محدود رکھتے ہیں۔"

ندا فاضلی کا یہی سب سے بڑا کمال ہے کہ وہ غزل تک محدود نہیں رہتے، بلکہ نظمیں بے شمار کہیں اور ان میں تجربات مشاہدات کے وہ جوہر دکھائے کہ آج وہ اردو نظم کے اہم شاعر تسلیم کیے جاتے ہیں۔

پرائی آگ

اندھیرے رات ہے یا برف کا سمندر ہے
خیال ذہن میں آتے ہی ڈوب جاتے ہیں
ہوائیں!
جیسے کوئی برچھیاں چلاتا ہے
ٹھٹھرتی جسم کو لیکر کہاں چلا جاؤں
پلیٹ فارم کے کونے میں دو پرانے لحاف
سکڑتے مڑتے لپٹتے سرکتے جاتے ہیں
ٹہلتے پاؤں اچانک ٹھٹھکتے جاتے ہیں
دیا سلائی کے شعلوں سے کچھ نہیں ہوگا
پرائی آگ پہ
ہاتھوں کو تاپتے رہتے
نہیں تو صبح تلک یونہی کانپتے رہتے

ایک نظم

ایک کہرا ایک لمبی رات ڈھول بجلی چیختی برسات
ریت کے ذرات میں آنچل میں تمہارے بھر دئے ہیں
باندھ لینا کل سمٹے گا بوڑھا سوداگر اگر گزرے ادھر سے

خود آواز دے گا

تم بھلے خاموش رہنا کچھ نہ کہنا
میلے آنچل میں بندھا یہ بوجھ
اپنی قسمت مانگ لیگا

''منفرد لہجہ'' اسی طرح کی بہت سی نظمیں ہیں جنھیں ندا فاضلی نے اپنی زندگی کے تجربات اور مشاہدات کے نمونے پیش کئے ہیں زبان و بیان کے تجربات کو جو علامتی انداز ندا فاضلی نے بخشا وہ انھیں کا حصہ ہے۔ بشر نواز لکھتے ہیں:

''ہر تخلیق کار کو اپنا انداز اظہار خود دریافت کرنا پڑتا ہے، دریافت کا یہ عمل پیچیدہ بھی ہوتا ہے اور اکثر بھٹکانے والا بھی پیچیدگیوں کے اس میں کئی عوامل کارفرما ہوتے ہیں، جنھیں ایک دوسرے سے الگ نہیں کیا جا سکتا، یہ عوامل ماضی و حال کے نئے رشتے تعمیر اور اس رشتہ کا جمالیاتی توازن کے مراحل ہیں اور بھٹکانے والا یوں کہ اکثر تخلیق کا اجتہاد کے شوق میں ہیئت پرستی اور لفظی کرتب بازی کا شکار ہو جاتے ہیں، ہوتا یوں ہے کہ اپنے لب و لہجے کی تلاش کا عمل شخصیت کے شعور کے ساتھ شروع ہو جاتا ہے، جہاں یہ شعور اس تلاش میں شامل نہیں ہوتا، وہاں فیشن زدہ چمک دمک سے ضرور آراستہ ہو جاتی ہے، لیکن اس میں زندگی کی حرارت پیدا نہیں ہوتی۔ ندا فاضلی کی بڑی کامیابی یہ ہے کہ انہوں نے کرتب بازیوں اور لفظوں میں جنھیں جدید شاعری کے ابتدائی دور میں مکتبی قسم کے نقادوں کا اعتبار حاصل تھا، الجھے بغیر اپنا لہجہ پالیا ہے وہ اپنے موضوع اور لہجے کو ہم آہنگ کرنے کا ہنر جانتے ہیں اور اپنے انداز و اسلوب سے جدید شاعری کی بھیڑ میں الگ پہچانے جاتے ہیں۔''

یہی انفرادیت ندا فاضلی کو اپنے ہم عصروں میں نمایاں کرتی ہے، وہ اپنی تجرباتی نظموں میں زندگی کے لامتناہی پہلوؤں پر گرفت رکھنے میں بڑے کامیاب ہیں یہی وجہ ہے کہ وہ آج سب کے محبوب شاعر ہیں۔

سوال یہ ہے کہ ندا فاضلی ہر خاص و عام کے محبوب شاعر کیوں بن گئے اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ انہوں نے جدیدیت کے صحیح مفہوم کو بہت پہلے ہی سمجھ لیا تھا۔ وہ خوب جانتے تھے کہ ان کے عہد کی قدریں بدل رہی ہیں، اس کا رشتہ ماضی سے ٹوٹ رہا ہے، آج

زندگی کن حالات سے دوچار ہے، ہنگاموں سے بھری دنیا نے انسان کا سکھ چین چھین لیا ہے ،رشتے سوئی کے دھاگے کی طرح ٹوٹ رہے ہیں، سارے بندھنوں کی بنیاد ذاتی مفاد پر ہے، تنہائی ہر شخص کا مقدر بن گئی ہے، زبان تو آزاد ہوگئی ہے لیکن انسانی آزادی کسی کو نہیں ملی وغیرہ۔

جدیدیت کے انھیں مفہوم کے ساتھ ساتھ اظہار کے لئے الفاظ بھی نئے ہیں، یہ سب ندا فاضلی صاحب خوب جانتے تھے اور اسی سوجھ بوجھ کے ساتھ انہوں نے اپنی شاعری کی ابتدا کی، وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ شاعری میں لفظ کی کیا اہمیت ہوتی ہے، پرانے ادب کو پڑھ کر اور رٹ کر نئی راہ اختیار کرنا بہت مشکل کام ہوتا ہے اور یہ مشکل کام ندا فاضلی نے کامیابی کے ساتھ انجام دیا ہے۔ ان کی شاعری آج کے ہر اس آدمی کی آواز ہے، جو عصرِ حاضر سے بیدار ہے۔

انتشار

ہر ایک جرم نام ہے- جو نام سنگسار ہے وہ نام بیقصور ہے
قصوروار بھوک ہے- جو مدتوں سے رائفل سے چیخ ہے پکار ہے
یہی گنہگار ہے- نہیں یہ بھوک تو کسی محل کی پہریدار ہے
غریب تابعدار ہے- گنہگار ہے محل مگر محل تو خود
ریاستوں کا اشتہار ہے- سیاستوں کے اردگرد بھی کوئی حصار ہے
عجب انتشار ہے- نہ کوئی چور چور ہے نہ کوئی ساہوکار ہے
یہ کیسا کاروبار ہے- خدا کی کائنات کا خدا ہی ذمہ دار ہے

ڈاکٹر رفیعہ شبنم عابدی رقمطراز ہیں:

"نظموں تک آتے آتے ندا کا ذہنی سفر آگے بڑھتا ہے، اب اس کی نظر نہ صرف اپنے گاؤں پر ہے نہ محض شہر تک اس کی نگاہ محدود ہے ندا کی نظر اب سارے عالم کی سیر کرتی ہے، اور اس وسعت نظر کے لئے غزل کا تنگ

داماں کافی نہیں ہوتا۔ آبگینہ صہبا سے پگھلتا ہوا محسوس ہوتا ہے لہٰذا ندا نظموں کے فارم کا سہارا لیتا ہے، نظمیں جو آزاد بھی ہیں اور نثری بھی، ان میں وہ اپنے خیالات کو آزادانہ طور پر پیش کرتا ہے، ندا کی نظموں میں دنیا ملتی ہے، علمی عالمی عالم انتشار ملتا ہے، اس سرے سے اس سرے تک پھیلی ہوئی سیاست اقتدار کی جنگ ایٹمی بلاؤں کا نزول سائنٹفک ترقی کی رحمتیں اور زحمتیں سماجی تقریریں فلسفے کی موشگافیاں نفسیاتی ادھیڑ بن امن وانسانیت کی ظاہری باتیں تباہ کاریاں وغیرہ۔''

یہاں ان کی وہ نظم پیش ہے، جو فسادات سے متعلق ہے، اس نظم میں وہ سب کچھ شاعر نے کہہ دیا ہے، جو آج ہماری سیاست کا حصہ بن گیا ہے، یہ نظم ندا فاضلی نے ۱۹۸۹ء میں بھارت بھون بھوپال میں ایشیاء کویتا کے اس پروگرام میں پڑھی تھی، جس میں دنیا بھر کے کم سے کم چالیس ملکوں کے شعراء نے حصہ لیا تھا۔

ایک لٹی ہوئی بستی کی کہانی

بجی گھنٹیاں
اونچے مینار گونجے
سنہری صداؤں نے
اجلی ہواؤں کی پیشانیوں پر
رحمت کے
برکت کے
پیغام لکھے
وضو کرتی ٹہنیں
کھلی کہنیوں تک منور ہوئیں
جھلملائے اندھیرے

بھجن گاتے آنچل نے
پوجا کی تھالی سے بانٹے سویرے
کھلے دروار
بچوں نے بستہ اٹھایا
بزرگوں نے پیڑوں کو پانی پلایا
نئے حادثوں کی خبر لے کر
بستی کی گلیوں میں اخبار آیا
خدا کی حفاظت کی خاطر
پولس نے
پجاری کے مندر میں
ملا کی مسجد میں
پہرا لگایا
خدا!
ان مکانوں میں لیکن کہاں تھا؟
سلگتے محلوں کے دیوار و در میں
وہی جل رہا تھا
جہاں تک دھواں تھا

ایک اور نظم دیکھئے جس میں ندا فاضلی نے جنگ کی ہولناکیوں کا ذکر کس طرح کیا ہے۔

جنگ

سرحدوں پر فتح کا اعلان ہو جانے کے بعد
جنگ!

بے گھر بے سہارا
سرد خاموشی کی آندھی میں بکھر کے

ذرہ ذرہ
پھیلتی ہے
تیل
گھی
آٹا
کھنکتی چوڑیوں کا روپ بھر کے
بستی بستی ڈولتی ہے
دن دہاڑے
ہر گلی کوچے میں گھس کر
بند دروازوں کی سانکل کھولتی ہے
مدتوں تک
جنگ!
گھر گھر بولتی ہے
سرحدوں پر اعلان ہو جانے کے بعد

ندا فاضلی کی یہ نظم اردو ادب میں ایک منفرد نوعیت کی نظم ہے، ندا فاضلی کی نظموں میں فکر کی گہرائی اور آفاقیت جگہ جگہ نمایاں ہے، ندا کی نظم جنگ کی وہ پوری تصویر اور تصور پیش کرتی ہے، جو ذہن میں آتے ہی ہم جنگ کے ختم ہونے کے بعد کے حالات کا سامنا کرتے ہیں، کیا مصیبتیں جھیلنا پڑتی ہیں ان تمام باتوں کا احساس دلاتی ہے، بقول نشر نواز:

''یہ نظم جہاں ختم ہوتی ہے، وہیں سے شروع ہوتی ہے اور جنگ کے بعد سکون ہولنا کی اپنا احساس دلاتی ہے۔''

سرحدوں پر فتح کا اعلان ہو جانے کے بعد اسی طرح یہ نظم بہت مشہور ہے، جسے وہ ہر مشاعرے میں بڑے اہتمام اور خود اعتمادی کے ساتھ پڑھتے ہیں، جو ان کے والد کی موت پر لکھی ہے۔

تمہاری قبر پر
میں فاتحہ پڑھنے نہیں آیا
مجھے معلوم تھا
تم مر نہیں سکتے
تمہاری موت کی سچی خبر جس نے اڑائی تھی
وہ جھوٹا تھا
وہ تم کب تھے
کوئی سوکھا ہوا پتہ ہوا سے مل کے ٹوٹا تھا
مری آنکھیں
تمہارے منظروں میں قید ہیں اب تک
میں جو بھی دیکھتا ہوں
سوچتا ہوں
وہ وہی ہے
جو تمہاری نیک نامی اور بدنامی کی دنیا تھی
کہیں کچھ بھی نہیں بدلا
تمہارے ہاتھ
میری انگلیوں میں سانس لیتے ہیں
میں لکھنے کے لئے
جب بھی قلم، کاغذ اٹھاتا ہوں
تمہیں بیٹھا ہوا میں اپنی ہی کرسی میں پاتا ہوں

یہ ندا فاضلی کی وہ نظم ہے، جس میں زندگی کی ایک تلخ حقیقت ہے، اس نظم میں وہ تمام کیفیت پوشیدہ ہے، وہ داد ہے اور محرومی ہے جسے شاعر نے اپنے فن کے ذریعہ اسے اور بھی کمال تک پہنچا دیا ہے۔ والد کے انتقال کی خبر سن کر ایک حساس شاعر نے جو کچھ دل پر گذری اسے الفاظ میں پرو کر اپنے غم کو چھپالیا اور ایک جھنجھلاہٹ کے ساتھ یہ کہنا کہ تمہاری موت کی خبر سنانے والا جھوٹا ہے، تم کہاں مرے ہو، میرے ہی اندر موجود ہو کہنے کا مطلب صرف یہ ہے کہ یہ نظم ندا فاضلی کی ایک شاہکار نظم ہے اسی نظم کے بارے میں بشر نواز لکھتے ہیں:

''زندگی اور موت کا بظاہر یہ تضاد والد کی موت پر ایک نظم میں ایک نئی اور غیر متوقع حمیت اختیار کرتا ہے اور زندگی کو احساس دلاتا ہے، یہاں موت پر ہر چیز کا اختتام نہیں بلکہ ایک سلسلہ در سلسلہ بن جاتی ہے، شکلیں اور چہرے بدلتے ہیں لیکن زندگی چلتی رہتی ہے یہ نظم اپنے موضوع کے برتاؤ اور جذباتی نظم وضبط کے لحاظ سے اردو کی اہم نظموں میں سے ایک ہے۔ یہاں زندگی شکل اور جسم کے حدود توڑ کر وسیع تر تناظر میں نظر آتی ہے، سیدھے سادے الفاظ ایک خاص ترتیب پا کے نظم کا تانا بانا بنتے ہیں اور نظم مصرعوں میں نہیں بلکہ پوری اکائی کی صورت میں اپنی معنوی تہیں کھولتی چلی جاتی ہے۔''

ندا فاضلی بنیادی طور پر نظم کے شاعر ہیں، ان کی نظمیں زندگی کے ہر پہلو کا احاطہ کئے ہوئے ہیں۔

صبح کی دھوپ
دھلی شام کا روپ
فاختاؤں کی طرح سوچ میں ڈوبے تالاب
اجنبی شہر کے آکاش
اندھیروں کی کتاب

ننھے پودے کی ٹہنی میں چمکتے معصوم گلاب
گھر کے آنگن کی مہک
بہتے پانی کی کھنک
سات زندگی کی دھنک
تم کو دیکھا تو نہیں ہے لیکن
میری تھالی میں یہ رنگ برنگے منظر
جو بھی تصویر بناتے ہیں
وہ تم جیسی ہے

ندا فاضلی کے موضوعات زندگی کے مختلف پہلوؤں کو سمیٹے ہوئے ہیں، جن میں زندگی، گھر، گاؤں، شہر، مسافر، ماں، باپ غرض یہ کہ کوئی پہلو زندگی کا ایسا نظر نہیں آتا، جس پر ندا فاضلی کی نظر نہ پڑی ہو اور ایک سچے فن کار کا کردار کرتے ہیں، ندا نے اپنا حق ادا کر دیا ہے، ندا فاضلی کا مشاہدہ اور مطالعہ دونوں گہرے ہیں، ان کی ہر نظم میں ان کی فنکارانہ صلاحیتیں نظر آتی ہیں۔ جب کوئی ایسا شخص جس نے دیہات کی زندگی یا چھوٹے قصبوں میں اپنا وقت گذارا ہو اور اچانک غم اور روزگار سے پریشان ہو کر کسی بڑے شہر میں چلا جائے تو کیا کیا دشواریاں اور کیسے کیسے حالات کا سامنا کرنا پڑتا ہے، چونکہ ندا فاضلی نے اپنی زندگی کے پیشتر دن گوالیار میں گذارے اور اچانک ہی بمبئی جیسے بڑے شہر میں اپنی روزی روٹی کے سلسلے میں جانا پڑا، اور جن حالات کا سامنا کرنا پڑا، وہ ان کی نظموں میں غزلوں میں گیتوں میں ہر جگہ نمایاں ہے اور ایک سچا فنکار وہی ہوتا ہے جو اپنی زندگی کے تجربات اور مشاہدات کو اپنے فن میں پیش کرے، اس سلسلے میں مشہور افسانہ نگار انور خان لکھتے ہیں:

''ایک حساس ذہن انسان جب چھوٹے قصبے سے بمبئی یا کلکتہ جیسے شہر میں پہنچتا ہے، تو ہکا بکا رہ جاتا ہے اردو شاعری میں شہر کی ہیبت ناکی اور غیر انسانی رویے کا ذکر کوئی نئی بات نہیں، اختر الایمان، سردار جعفری، جاں نثار اختر،

باقر مہدی، عزیز قیسی، عمیق حنفی، شہاب جعفری اور دوسرے کئی شعراء کے یہاں اس کا ذکر مل جائے گا، شہری مزاج مجلسی اخلاق اور شہری قدروں اور رویوں پر البتہ بہت کم غزلیں ملیں گی۔ شاید چند مثالیں اختر الایمان، باقر مہدی، یا بلراج کومل کے یہاں مل جائیں، ندا فاضلی کا یہی خاص موضوع ہے۔''

خاص طور پر گھر ندا فاضلی کے یہاں بڑی اہمیت رکھتا ہے، یہ ایک لفظ ندا فاضلی نے بار بار استعمال کیا ہے، غزلوں میں نظموں میں گیتوں میں ہر جگہ نظر آئے گا، ندا فاضلی کے یہاں لفظ گھر اردو کے دیگر شعراء کی طرح نہیں ہے بلکہ مختلف ڈھنگ مختلف طریقوں سے گھر نئے طریقوں اور استعاروں کے ذریعہ ان کی پوری شاعری پر چھایا ہوا ہے، اس کی کئی وجوہات ہیں، سب سے پہلے تو یہی ہے کہ ندا فاضلی نے گھر کئی بار کھویا ہے، گھر کا چھن جانا اچانک گھر سے بے گھر ہو جانا، ماں باپ کا بچھڑ جانا، پاکستان چلے جانا، بہن بھائیوں سے بچھڑنا اور پھر ان سے ان کا گھر چھن جانا بے خوابی میں ایک رات گھر جانا، کنڈی تک ہاتھ اٹھانا اور پھر خیال آنا کہ گھر اب اپنا نہیں رہا، ان تمام باتوں سے ندا فاضلی کے یہاں گھر لفظ کی اہمیت دیگر شعراء سے الگ اور خاص ہو گئی ہے، یوں سمجھئے کہ گھر ان کی پوری شاعری میں ایک خاص اہمیت رکھتا ہے، یہی وجہ ہے کہ گھر ان کے یہاں ایک خاص نمایاں خصوصیت بن چکا ہے۔

چاہے وہ نظمیں ہوں، چاہے وہ گیت ہوں یا غزلیں ہوں ہر تخلیق میں گھر کو اہمیت حاصل ہے، جس شاعر نے گھر کو کئی بار اجڑتے ہوئے دیکھا ہو ظاہر ہے کہ اس کی تخلیق میں اس کے فن میں بھی جگہ جگہ وہی بات ہوگی، یہاں کچھ ایسی نظموں کے اقتباسات پیش ہیں، جن میں گھر یار نئے نئے معنی اور نئے نئے استعاروں کے ساتھ نظر آتا ہے۔ نئے گھر کی پہلی نظم۔

چاروں دیواروں پہ چھت باندھ کے
جب وہ اترا

جسم تھا اس کا پسینے سے شرابور

مگر

اسکو آرام کی مہلت نہ ملی

شہر تو بعد میں ویران ہوا

مرا گھر خاک ہوا تھا پہلے

اس نظم کے بارے میں بشر نواز لکھتے ہیں:

''یہاں گھر صرف چار دیوار کا اور چھت کا نام نہیں ہے، بلکہ یہ ایک ذہنی کیفیت ہے، جس میں سکون تحفظ کا احساس اور تنظیم ہے''

ندا فاضلی کے یہاں گھر کی نوعیت دیگر شاعروں سے مختلف ہے ندا نے اپنے گھر کو دو بار کھویا ہے، پہلی جب اس گھر کو سیاست کی چیرہ دستیوں نے چھینا تھا، جس کا ذکر ندا فاضلی نے اپنے پہلے مجموعہ کلام ''لفظوں کا پل'' کے دیباچے میں کیا ہے۔ دوسری بار بہت دنوں کے بعد جب وہ کراچی گیا تو اسے اپنے ہی گھر میں اپنا گھر نہیں ملا

دور کا ستارہ

میں برسوں بعد

اپنے گھر کو تلاش کرتا ہوا

اپنے گھر پہنچا

لیکن مرے گھر میں

اب میرا گھر ہی نہیں تھا

اب میرے بھائی اجنبی عورتوں کے شوہر بن چکے تھے

میرے گھر میں

اب میری بہنیں

انجانے مردوں کے ساتھ مجھ سے ملنے آتی تھیں

اپنے اپنے دائروں میں تقسیم
میرے بھائی بہن کا پیار
اب صرف لفظوں کا لین دین بن چکا تھا
میں جب تک وہاں رہا
شیو کرنے کے بعد
برش، کریم سیفٹی، ریزر، خود دھو کر اٹیچی میں رکھتا رہا
میلے کپڑے، خود گن کر لانڈری میں دیتا رہا
اب میرے گھر میں وہ نہیں تھے
جو بہت سوں میں بٹ کر بھی
پورے کے پورے میرے تھے
جنھیں میری ہر کھوئی ہوئی چیز کا پتہ یاد تھا
مجھے کافی دیر ہوگئی تھی
دیر ہو جانے پر ہر کھویا ہوا گھر
آسمان کا ستارہ بن جاتا ہے، جو دور سے بلاتا ہے
لیکن پاس نہیں آتا

اس نظم میں ندا فاضلی نے اپنے وہ تجربات بیان کئے ہیں جو انھوں نے اپنے گھر کی تلاش میں کیے ہیں، اسی نظم سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے، ندا فاضلی کے یہاں لفظ گھر کو کیا اہمیت حاصل ہے اور گھر ان کی شاعری میں کیا اہمیت رکھتا ہے۔

خاص طور سے ندا فاضلی کی شاعری تحلیل نفس سے ابھرنے والی تصویر ہے اور یہ تصویر زندگی کی کھٹی میٹھی اور کڑوی باتیں عام بول چال کی زبان میں کرتی ہیں۔ ابتدائی نظموں اور غزلوں میں گھر کے آس پاس کی فضا اور گھر سے باہر بازار کی دنیا کی خوبصورت تصویر میں پیش کرتی ہے۔

ایک نظم کا اقتباس پیش ہے۔

گھر کا منظر

گرم چولہے کے قریب بیٹھی ہوئی ایک عورت
ایک پیوند لگی ساڑی سے تن کو ڈھانکے
دھندلی آنکھ سے مری سمت تکے جاتی ہے
مجھکو آواز پہ آواز دیئے جاتی ہے
کیوں مری ماں کی جدائی سے پگھل جاتا ہے

ندا فاضلی کے گھر سے بے گھر ہو جانا، پھر سے گھر کی تلاش میں سرگرداں رہنا اور جس گھر کو اپنا گھر سمجھ کر جانا اس گھر میں ایک اجنبی کی طرح رہنا، ان تمام باتوں نے ندا فاضلی کی شاعری میں گھر کو ایک خاص لفظ بنا دیا ہے، نئے نئے ڈھنگ اور نئے نئے طریقوں سے گھر ان کی شاعری میں آیا ہے۔ اور پھر پورا اعتماد کے ساتھ یہاں ایک نظم پیش کی جا رہی ہے خدا کے تصور کے بارے میں اس نظم میں گھر ایک نئے روپ میں دیکھئے۔

انتقام

روز میں چاند بن کے آتا ہوں
دن میں سورج سا جگمگاتا ہوں
کھنکتا ہوں ماں کے گہنوں میں
ہنستا رہتا ہوں چھپ کے بہنوں میں
مسجدوں میں مسجد کی مشعلیں ہوئیں روشن
بے چراغ گلیوں میں کھیلتا خدا دیکھتا ہوں

خدا کا گھر نہیں کوئی

بہت پہلے ہمارے گاؤں کے اکثر بزرگوں نے
اسے دیکھا تھا

یہیں تھا وہ
یہیں بچوں کی آنکھوں میں
مہکتے سبز پیڑوں میں وہ رہتا تھا
ہواؤں میں مہکتا تھا
ندی کے ساتھ بہتا تھا
ہماری پاس وہ آنکھیں کہاں ہیں
جو پہاڑی پر چمکتی بولتی آواز کو دیکھیں
ہمارے واسطے اب پھول ہنستے ہیں
نہ کونپل گنگناتی ہے
خاموش اندھیروں میں سنہرے گیت گاتی ہے
ہمارا عہد ماں کے پیٹ سے اندھا ہے، بہرہ ہے
ہمارے آگے پیچھے موت کا تاریک پہرہ ہے

''انتقام'' اور ''خدا کا گھر نہیں کوئی'' دونوں نظموں پر بشر نواز لکھتے ہیں:

''روز چاند بن کے، یہ خدا ہے، جو ایک جملے جمائے معصوم سے معاشرے کی ہر چیز میں جلوہ نمائی کرتا ہے، اس خدا کو آسمانی دھندلکوں میں ڈھونڈنے کے بجائے ندا فاضلی نے ذہن میں سانس لیتے رشتوں میں تلاش کیا ہے، جو وحدانیت کے تصور خدا سے زیادہ قریب ہے۔

رشتوں کی اس تنظیم کے ٹوٹ جانے اور اس کے ساتھ انسانی فطری معصومیت کی دردناک موت کے بعد انسانی ضرورت سے زیادہ تنہا اور غیر محفوظ ہو جاتا ہے۔ اسی طرح اس نظم میں ''یہیں تھا وہ''

وہ گیا اب خدا قصۂ پارینہ بن چکا ہے
نہیں

"آج کا انسان ہی اپنی بصیرت کھو چکا ہے
اس کی نگاہیں اب روشن نہیں ہیں

اس تیز رفتار اور تجارتی معاشرے نے کائنات کے اندرونی روابط اور رشتوں کو دیکھ سکنے کی صلاحیت چھین لی ہے۔ گھر، خدا اور شہر ندا فاضلی کی شعری رامائن کے تین کردار ہیں۔ گھر، خدا اور شہر ندا کی پوری شاعری میں گھر بڑی اہمیت رکھتا ہے، جو وہ نئے نئے طریقے اور نئی نئی علامتوں کے ساتھ استعمال کرتے ہیں، اب اس نظم میں جس کا عنوان ہے، نئے گھر کی پہلی نظم، جس کے بارے میں بہت سے تنقید نگاروں نے اپنی اپنی رائے کے ذریعہ اس کی معنویت پر روشنی ڈالی ہے، بشر نواز کے اقتباس کو لکھا جا چکا ہے۔

نئے گھر کی پہلی نظم

چار دیواروں پر چھت باندھ کے
جب وہ اترا
جسم تھا اس کا پسینے سے شرابور
مگر
اس کو آرام کی مہلت نہ ملی
گھر کی دیواروں نے
دیواروں کی زینت کے لئے
نیلے آکاش میں اڑتے ہوئے
اس کے سر کو
ایک کمرے میں مقفل کر کے
اس کے بے سر کے بدن کے اوپر
ساز و سامان کی
فہرست لگا دی اپنے

کوئی ڈھلوان پر پہیئے کو گھما دے جیسے
دیکھتے دیکھتے
ٹی وی
فرج
صوفہ بن کے
آدمی کھو گیا عزت کا تماشا بن کے
ہر گھڑی بھاگتے رہنا ہے
مقدر اُس کا
گھر کی دیواروں نے ہی
چھین لیا گھر اس کا

اس نظم میں ندا فاضلی نے شاعری کے بعض اصناف کی آزادی محدود ہونے کا اور ازدواجی زندگی کی ذمہ داریوں میں الجھنے کا مرثیہ پڑھا ہے۔ شاعری کے بعد سماجی عزت آج کے جدید گھریلو سامان کے مہیا کرنے سے اخراجات کے باہر کا احساس کیا ہے۔ جیسے صوفہ، ٹی وی، فرج وغیرہ جمع کرنا لازمی ہو جاتا ہے، اب ازدواجی زندگی کے لئے ان تمام آسائشوں کی ضرورت کے بغیر سماج میں عزت ناممکن ہے، پہلے شاعر آزاد تھا، مندرجہ بالا چیزوں کی اسے خاص ضرورت نہیں تھی، جو فکر بن کر شاعر کے بعد شاعر کی الجھن بن گئی ہے اور شاعر ایک سماجی تماشہ بن کر رہ گیا ہے، اس کے اندر کا انسان ان ذمہ داریوں میں ہمیشہ کے لئے پھنس چکا ہے۔

گھر کے متعلق ایک اور نظم دیکھئے۔

کچی دیواریں

میری ماں
ہر دن اپنے بوڑھے ہاتھوں سے

ادھر ادھر سے مٹی لا کر
گھر کی کچی دیواروں کے زخموں کو بھرتی رہتی ہے
تیز ہواؤں کے جھونکوں سے
بے چاری کتنی ڈرتی ہے
میری ماں کتنی بھولی ہے
برسوں کی سیلی دیواریں
چھوٹے موٹے پیوندوں سے
آخر کب تک رک پائیں گی
جب کوئی بادل
گرجے گا
ہر ہر کرتی ڈھے جائیں گی

اس نظم میں ندا فاضلی نے گھر میں کو سمبل بنا کر نئی پرانی تہذیب کا رونا رویا ہے، اسی طرح ایک اور نظم دیکھیے، یہاں گھر کس روپ میں ہے۔

لگاؤ

تم جہاں بھی رہو
اسے گھر کی طرح سجاتے رہو
گلدان میں پھول لگاتے رہو
دیواروں پر رنگ چڑھاتے رہو
سجے بنے گھر میں
ہاتھ پاؤں اگ آتے ہیں
پھر تم کہیں جاؤ
بھلے ہی تم اپنے آپ کو بھول جاؤ

تمہارا گھر
تمہیں ڈھونڈ کر واپس لے آئے گا

ظاہر ہے کہ انسان کو گھر اچھا لگتا ہے، چاہے وہ کہیں بھی چلا جائے، اسے آرام ملتا ہے تو بس اپنے ہی گھر میں ملتا ہے، بشرطیکہ آرام کا سامان ہو، اس طرح بیشمار نظموں میں غزلوں میں گیتوں میں دوہوں میں ندا فاضلی نے گھر کو استعمال کیا ہے، ندا فاضلی بنیادی طور پر نظم کے شاعر ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ زندگی کے بے شمار موضوعات ندا فاضلی کی نظموں میں نظر آتے ہیں۔ گاؤں، شہر، گھر، خدا، دو گھڑیاں، رنگ محل، ایک لڑکی، ایک ملاقات، دوپہر شام، موت، بجلی کا کھمبا، پگھلتا سورج، مشورہ، پیدائش، شعور مرگ، بے خواب نیند، جیون، دکھ، پاسپورٹ آفیسر کے نام، موت کی نہر وغیرہ وغیرہ۔ جو تجربہ جو مشاہدہ ندا فاضلی نے کیا، وہ ان کی شاعری میں ان کی نظموں میں مل جائے گا۔ چاہے وہ گھر سے ملتا ہو چاہے جنسیات سے متعلق ایک سچے فنکار کی حیثیت سے شاعر نے اپنی شاعری میں سمو دیا ہے، یہاں کچھ نظمیں جو زندگی کے مختلف موضوعات سے متعلق پیش کی جا رہی ہیں۔ جنہیں پڑھ کر اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ندا فاضلی نے کیسے کیسے موضوعات کو اپنی نظموں میں پیش کیا۔

کسی قصائی نے
ایک ہڈی چھیل کر پھینکی
گلی کے موڑ سے دو کتے بھونکتے اٹھے
کسی نے دم پٹکی
بہت سے کتے کھڑے ہو کر شور کرنے لگے

نہ جانے میرا کیوں جی چاہا
اپنے سب کپڑے اتار کر کسی چوراہے پر کھڑا ہو جاؤں
ہر ایک چیز پر جھپٹوں
گھڑی گھڑی چلاؤں

جسم پھیلاؤں
ہزاروں سال کی سچائیوں کو جھٹلا دوں

اب اس نظم میں ندا فاضلی نے کشمیر کو موضوع سخن بنایا ہے، ۱۹۶۵ء میں کشمیر حاصل کرنے کے لئے ہندوستان و پاکستان کی جنگ کو نفرت کے لہجے میں لیا ہے، اس نظم میں شاعر نے اپنی صلاحیتوں کو بھرپور فنکارانہ انداز میں پیش کیا ہے اور سیاست پر کڑی نظر رکھنا ایک سچے فنکار کی پہلی اور اہم ضرورت ہے یہ بات ندا فاضلی کی اپنی پوری شاعری پر عائد ہوتی ہے، یہ ایک نظم ''خدا خاموش ہے'' دیکھیے، جس میں ندا فاضلی نے دنیا کے ہنگاموں اور افراتفری کے عالم میں ایک گہری نظر ڈالتے ہوئے خدا سے بات چیت کی ہے ،شکایت کی ہے کہ آخر دنیا کے ہنگاموں کو کب تک خاموشی سے دیکھتا رہے گا۔

خدا خاموش ہے

بہت سے کام ہیں
لپٹی ہوئی دھرتی کو پھیلا دیں
درختوں کو اگائیں
ڈالیوں پر پھول مہکا دیں
پہاڑوں کو قرینے سے لگائیں
چاند لٹکائیں
خلاؤں کے سروں پہ
نیلگوں آکاش پھیلائیں
ستاروں کو کریں روشن
ہواؤں کو گتی دیدیں
پھدکتے پتھروں کو پنکھ دے کر نغمگی دیدیں
لبوں کو مسکراہٹ

انگھڑیوں کو روشنی دے دیں
سڑک پہ ڈولتی پرچھائیوں کو
زندگی دیدیں

خدا خاموش ہے
تم آؤ تو تخلیق ہو دنیا
میں اتنے سارے کاموں کو اکیلا کرنہیں سکتا

اس نظم میں ندا فاضلی کہتے ہیں کہ ساری دنیا انسان کی بنائی ہوئی ہے اور آج بھی خدا خاموش ہے یعنی کہ خدا کچھ نہیں کرتا، آج بھی دنیا کی برائیاں انسان ہی کو دور کرنا ہیں، تو پھر خدا کیوں خاموش ہے، جب سب کچھ انسان ہی کرے گا تو خدا کے ذمہ کیا ہے، یوں تو ندا فاضلی کی تمام نظموں میں زندگی کی سچائیاں ہی میں گیرائی نمایاں ہیں لیکن ایک چیز جو ندا فاضلی کو دیگر شعراء سے ممتاز کرتی ہے، وہ ہے ان کا لہجہ، کوئی بھی نظم ہو غزل ہو یا کہ نثر ہو ندا فاضلی نے اپنی انفرادیت کی چھاپ ایک ایک لفظ میں چھوڑی ہے، ندا فاضلی کی نظموں میں سماجی معنویت کے علاوہ عصری آگہی اور ذات کے کرب کا احساس نئی نئی علامتوں کے وسیلے سے ہر جگہ دکھائی دیتا ہے۔ یہاں ایک مشہور نظم ''تلاش'' پیش ہے، جو ماہنامہ ''گفتنی'' کوکن بمبئی کے مارش اپریل ۱۹۸۰ء کے شمارے میں شائع ہوئی ہے، اس کے علاوہ بھی کئی رسائل میں چھپی اور فلم ''آپ تو ایسے نہ تھے'' میں محمد رفیع کی آواز میں کچھ تبدیلی کے ساتھ شامل کی گئی ہے۔

تلاش

جہاں بھی جاؤں یہ لگتا ہے تیری محفل ہے
ہر ایک انگ ترے روپ کی جھلک لے لے
کوئی ہنسی کوئی لہجہ کوئی مہک لے لے

یہ آسمان یہ تارے یہ راستے یہ مکاں
ہر ایک چیز ہے اپنی جگہ ٹھکانے سے
کئی دنوں سے شکایت نہیں زمانے سے
شناسا ہو گئے بچوں کے اجنبی چہرے
کبوتروں کی اڑانوں میں خواب ہیں میرے
کچھ ایسا لگتا ہے سارے گلاب ہیں میرے
مری تلاش تری دلکشی رہے باقی
خدا کرے کہ یہ دیوانگی رہے باقی

ندا فاضلی کی یہ وہ مشہور نظم ہے، جو آج بچے بچے کی زبان پر ہے، فلم میں آنے کی وجہ سے اور گلی گلی پہنچ گئی، ندا فاضلی کی نظموں میں سیاسی انتشار آس پاس کی گھریلو فضا ملتی ہے۔ جس موضوع کو بھی ندا فاضلی نے اپنے فن کے ذریعہ زندگی عطا کر دی ہے، معمولی سے معمولی موضوع کو بھی ندا نے اپنے اظہار کے لئے نظم کو ہی وسیلہ بنایا ہے، سب سے اہم بات یہ ہے کہ ندا فاضلی نے مبہم اور پوشیدہ استعاروں سے ہمیشہ پرہیز کیا ہے، بہت عام اور سیدھے سادے الفاظ میں زندگی گذاری ہے، سماجی زندگی کے اتار چڑھاؤ اور گاؤں شہروں کی بے کیف زندگی ماں باپ، بہن بھائی کے رشتوں کو ندا فاضلی نے اپنا موضوع بنایا ہے، اردو کی نئی نظم کو ندا فاضلی نے بہت کچھ دیا ہے۔

نئی نظم کو بے معنویت اور غیر اہم موضوعات سے بچایا ہے، بلکہ ہمارے آس پاس کی زندگی میں ہونے والے واقعات کو انھوں نے نظموں میں پیش کیا ہے، ''سحر'' یہ ایک نظم ہے جو فطرت کے مناظر پر ہے۔

سحر

سنہری دھوپ کی کلیاں کملاتی
گھنی شاخوں میں چڑیوں کو جگاتی

ہواؤں کے دوپٹے کو اڑاتی

ذرا سا چاند ماتھے پہ اگا کے

رسیلے نین کو کاجل سے سجا کے

چنبیلی کی کلی بالوں میں ٹانکے

سڑک پہ ننھے ننھے پاؤں دھرتی

مزے لے لے کے سکٹ کترتی

سحر مکتب میں پڑھنے جارہی ہے

دھندلکوں سے جھگڑنے جارہی ہے

فطرت کے تمام مناظر پر ندا فاضلی نے بہت خوبصورت نظمیں لکھی ہیں، سحر، شام ،دوپہر، دھوپ، آسمان، نیل گگن، یہاں کچھ ایسی ہی نظمیں پیش کی جارہی ہیں۔

دوپہر

جسم لاغر ستا ہوا چہرہ

ہر تبسم پہ درد کا پہرہ

پپی پر پوری بنت کی جالی

جیب میں گول میز کی تالی

ہاتھ میں روشنائی کی لالی ہے

اڑتی چیلوں کا جھنڈ تکتی ہوئی

تپتے سورج کو سر سے ڈھکتی ہوئی

کچھ نہ کچھ منہ ہی میں بکتی ہوئی

خشک آنکھوں میں پانی چھپا کر

پیلے ہاتھی کا ٹھونٹ سا لگا کر

دوپہر چائے پینے بیٹھی ہے

چاک دامن کو سینے بیٹھی ہے

اب ایک نظم شام کے منظر پر دیکھیے ۔

شام

سوکھے کپڑوں کو چھت سے چنتی ہوئی
پیلی کرنوں کا ہار بنتی ہوئی
گیلے بالوں میں تولیا لپٹائے
ہاتھ میں ایک کٹی پتنگ کو اٹھائے
دائیں بازو پہ تھوڑی دھوپ سجائے
سیڑھیوں سے اتر کے آئی ہے
کس قدر بن سنور کے آئی ہے
بجتے ہاتھوں سے چمنیاں دھوکر
گھر کے ہر کام سے سبک ہوکر
پالنے کو جھلا رہی ہے شام
پیالیوں میں گلا رہی ہے شام
چند اماموں اگا رہی ہے شام

اس طرح ایک اور نظم جو حال ہی میں یعنی ۱۰ر مارچ ۱۹۹۱ء کے روزنامہ ''آفتاب جدید'' میں شائع ہوئی ہے ۔

وہ جو پھٹے پرانے جوتے گانٹھ رہا ہے
وہ ہی میں ہوں
وہ جو گھر گھر دھوپ کی چاندی بانٹ رہا ہے
وہ بھی میں ہوں
وہ جو اڑتے پروں سے ابر پاٹ رہا ہے

وہ بھی میں ہوں
ہری بھری شاخوں کو کاٹ رہا ہے
وہ بھی میں ہوں
سورج چاند لگا کہیں میری
سال مہینے در میں میری
کل بھی مجھ میں آج بھی مجھ میں
چاروں اور دشائیں میری
اپنے اپنے آکاروں میں
جو بھی چاہے بھر لے مجھ کو
جس میں جتنا سما سکوں میں
اپنا اپنا کر لے مجھ کو
ہر چہرہ ہے میرا چہرہ
بے چہرہ ایک درپن ہوں میں
پل پل روپ بدلنے والی مٹی ہوں میں
دھرتی۔جیون ہوں میں

ندا فاضلی کی شاعری خالص ہندوستانی ہے، یہیں کی مٹی کی بو باس اور یہیں کی ہوا کی خوشبو اس میں شامل ہے، ان کی نظموں میں گیتوں میں غزلوں میں سب میں نمایاں ہیں، ان کے دل کی دھڑکن میں وطن کی خوشبو اس کا پیار ایک ایک لفظ سے نمایاں ہے، چاہے وہ گیت ہوں یا دوہے ہوں۔

جیون دکھ

آج تو
کوئی پردیسی سے لگتے ہو

تنہا تنہا چپ چپ ڈول رہے ہو تم
طور طریقے سارے بدلے بدلے ہیں
کوئی نئی سی بھاشا بول رہے ہو تم
تم شاید جیون بھر کے جادوگر ہو
طرح طرح کے روپ بدل رہے ہو تم
نئے سانچوں میں ڈھل رہے ہو تم
کبھی تم چلتے چلتے رستے میں
کسی چمکتی گڑیا کی خاطر
مجھ سے غصہ ہو کر نیر بہانے لگتے ہو
میرے دل پر تیر چلانے لگتے ہو
کبھی کبھی محفل کے سونے سونے گوشہ میں
کسی سہیلی سے میرا قصہ سن کر
تنہائی میں گھنٹوں سوچا کرتے ہو
بڑی بڑی آنکھوں سے رویا کرتے ہو
اور کبھی تم میرے ہی گھر میں آ کر
دن بھر کی محنت سے ٹوٹے ٹوٹے سے
دنیا کی ہر شے سے اوبے اوبے سے
میری بوڑھی ماں پر چلا پڑتے ہو
مریم جیسی پاک بہن سے لڑتے ہو
تم جیون کا دکھ ہو
ٹوٹے سپنے ہو
نام تمہارا چاہے کچھ بھی ہو

کالے گورے چہرے پہنے پھرتے ہو
ایک تم بھائی ہو محبوبہ ہو، بچے ہو
تم جیون کا دکھ ہو

میرے اپنے ہو
آج تو کوئی پردیسی سے لگتے ہو

ندا فاضلی نے اپنی نظموں میں گاؤں کی سرسبز وادیوں سے لے کر شہر کے ہنگاموں، انسانی دکھ درد، زندگی، موت، نفرت ومحبت ہر موضوع پر نظمیں کہیں ہیں، اور جس موضوع کو بھی ہاتھ لگایا اس کا حق ادا کر دیا ہے، معمولی سے معمولی نظم بھی ندا فاضلی نے زندگی کی دھڑکن سمودی ہے، اردو شاعری کی تقریباً ڈیڑھ سو سالہ روایت پر اور غزل کا رواج رہا ہے اور تقریباً ہر شاعر نے غزل کو ہی زیادہ اہمیت دی ہے بہت کم شاعروں نے نظمیں کہیں ہیں، عظیم شعری روایات اور جدید اردو شاعری کے بارے میں ایڈیٹر ''شاعر'' افتخار امام صدیقی نے اپنے رسالہ ''شاعر'' کے ایک اداریہ میں لکھا ہے:

''اردو کی عظیم شاعری کا تصور صرف غزل سے عبارت نہیں بلکہ نظم کی دیگر اصناف نے اسے لازوال شعری سرمایہ عطا کیا ہے، باکمال شاعروں نے اپنی تربیت یافتہ خلاقانہ ذہن سے حرف ولفظ کی روحانی تہوں کی غواصی کر کے بے شمار نامعلوم جہانوں کی سیاحی اور دنیا کے ارتقاء کے رنگ وروپ کی صورت گری کی ہے، غیر معمولی فنکاروں نے خیال وجذبے کی جو بھی کائنات خلق کی وہ حیرت وتحیر اور تلاش وجستجو کی ادبی تاریخ بھی بنی، اردو کی شعری اصناف کا تنوع بلحاظ ہیئت وموضوع اور فنکاروں کے داخلی آہنگ کی تربیت وتہذیب کا سبب بنا ، یہ شعری اصناف تمام بڑے فنکاروں کا وسیلۂ اظہار تھیں کہ محض غزل میں مصرع بیت کی سمائی ممکن نہیں تھی، حالانکہ موزونیت پر مکمل گرفت شاعری کے عرفان علوم ولولے کے ساتھ بے مثال ذخیرہ الفاظ وحرف ولفظ سے دوستی لغت

سے یاری ضابطہ درس وتدریس اور بے پناہ ریاضت نے عجز کلام کی کم سے کم گنجائش رکھی، لیکن اردو مثنوی، مرثیہ، قصیدہ اور بے شمار پابند نظمیہ فن پاروں نے غزل کی جادوگری سے الگ اردو زبان کو شعری ورثہ عطا کیا، ماضی یہ ورثہ ہمیں عظیم روایت تو بن گیا تاہم یہ روایت آج دوسرے درجہ کی اردو شاعری کا مزاق ازا رہی ہے کہ آج غزل آزاد نظم، نثری نظموں میں شاعری کا وہ طوفان نہیں ملتا جو ہمارے بزرگ شعراء نے نظم کی مختلف اصناف کلاسیکی شاعری کے ذریعہ ہمیں عطا کیا ہے۔

ہزاروں شعر تخلیق کرنے والے ماضی کے فنکاروں کا سلسلہ آج کی نئی نسل سے صرف چار سو پانچ سو شعر تک پہنچا ہے اور پھر یہ شاعری بھی کہاں ہے ، جو عجز کلام کرنے والے اور حشو وزوائد سے مملو شعر کی پہلی دوسری سطح سے کلام کرنے والے تربیت یافتہ ذہین عالم آشوب مثنوی، مرثیہ، قصیدہ، واسوخت، رباعی اور نظم کی دیگر اصناف سے بہت دور ہو گئے ہیں، عظیم پابند نظمیں تو اب ماضی کا ورثہ بن گئی ہیں۔''

غزل آزاد نظم اور نثری نظمیں ہیں، لفظ ہیئت کے بجائے صرف خیال رہ گیا ہے اور یہ خیالات بھی اکہرے بیانیہ ہیں، اردو شاعری کی روح ختم ہوگئی ہے جو اس مصرع، شعر اور نثر پارے میں تخلیقیت کے نام پر منفرد اضافہ مختلف اسلوب ولہجہ نہ جانے کیا کیا بنتے جا رہے ہیں، سوال یہ ہے کہ غزل کا سفر تو صدیوں پرانہ ہے۔

فضیل جعفری لکھتے ہیں:

''۱۹۵۵ء کے آس پاس دوڈھائی درجن شاعر سامنے آئے تھے اور جدید شاعری کی شناخت بنے تھے، ان میں بمشکل آدھے درجن ایسے شاعر بچے ہیں، جو آج بھی ذہنی اور عملی طور پر مثالی نظر آتے ہیں۔

ندا فاضلی ان گنے چنے شاعروں میں سے ایک ہیں یہ سچ ہے کہ ان

چند شعراء میں بھی وہ تخلیقی توانائی اور تخلیقی قوت نہیں رہ گئی، جو ۱۹۷۰-۱۹۸۰ء تک دکھائی دے رہی تھی، لیکن چونکہ ان کے بعد ابھی تک ان سے زیادہ طاقتور شاعر سامنے نہیں آئے اس لئے ان کی شاعری ہی خاص غنیمت نظر آتی ہے''۔

آگے اور اسی کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

''آنکھ اور خواب'' کے درمیان ندا فاضلی کا تیسرا مجموعہ کلام ہے جسے مکتبہ جامعہ دہلی کے ذیلی ادارے سے مکتبہ آواز نے شائع کیا ہے۔ ان کا پہلا مجموعہ کلام ''لفظوں کا پل'' اور دوسرا ''مور ناچ'' تھا، پلے مجموعہ کی اشاعت سے قبل ہی ندا فاضلی کو ان کے موضوعات اور موضوعات سے زیادہ ان کے دلکش اسلوب اور ان کی لفظیات میں پائی جانے والی دلکش ندرت کی وجہ سے ایک اہم جدید شاعر تسلیم کر لیا گیا تھا گذشتہ دہائیوں یا اس سے کچھ کم عرصے میں اس شعری اہمیت میں کوئی نمایاں اضافہ نہیں ہوا، تو کوئی خاص کمی نہیں آئی، در اصل ندا فاضلی نے شروع ہی سے اپنے لئے کسی شاہراہ کا نہ سہی لیکن ایک پگڈنڈی کا انتخاب ضرور کر لیا تھا۔''

آج تک استقلال سے قائم ہیں، یہاں چند نظمیں پیش ہیں، جن میں ندا فاضلی نے اپنے منفرد لہجے کے تحفے پیش کئے ہیں۔

نیا روگ

یہ دنیا روگ ہے
آج کے دور کا
اس نئے روگ کی کوئی پہچان ایسی نہیں
جس کی تشخیص ہو
ہر دوا بے اثر
سرنگوں چارہ گر

آج ہر لہلہاتے ہوئے کھیت میں
گیہوں کے ساتھ اگتی ہیں خاموشیاں
سرد خاموشیاں
جو گلے سے اترتے ہی گھُن کی طرح
چاٹ لیتی ہیں آواز کی بجلیاں
بند ہونٹوں کا یہ خوش لباس آدمی
دیکھتا ہے
مگر بول سکتا نہیں
سوچتا ہے
مگر چیخ سکتا نہیں

☆

ایک اور نظم دیکھئے۔

راستے کی منطق

ابھی ابھی جو گیا ہے دھکیل کر تم کو
اسے برا نہ کہو، اپنے پیر مت روکو
جو چل سکو تو چلو، ورنہ راستہ چھوڑ دو
تمہارے پیچھے بھی کچھ لوگ آرہے ہوں گے
دیا کی بھیک نہ مانگو، بڑھے چلو
ابلتی بھیڑ کی لہریں ہیں، تیز دھار بہت
یہاں کسی سے کسی کی نظر نہیں ملتی
نہ دوستی نہ محبت، نہ فلسفہ کوئی
یہ راستہ ہے یہاں راستے کی منطق نہیں

تلاش سب کو ہے
وضع........ہے ساری
کوئی پھسلتا ہے، کوئی پھلانگ جاتا ہے
جو آگے بڑھ جاتا ہے، دو چار کو گراتا ہے
اسے برا نہ کہو، تلاش سب کو ہے

یہ وہ نظمیں ہیں، جو ان کی مشہور کتاب ''مورناچ'' میں شامل ہیں، ندا فاضلی کا پہلا مجموعہ کلام ''لفظوں کا پل'' ہے جس میں ان کی ابتدائی شاعری ہے اور دوسرا شعری مجموعہ ہے ''مورناچ'' جو ان کی شاعری کے عروج کے زمانے کی ہے، جس میں نہ صرف ان کی منتخب نظمیں، غزلیں اور گیت ہیں بلکہ ان کی فکر ان کی زندگی کی تلخ سچائیاں شامل ہیں، حالانکہ ان دونوں مجموعوں کے بعد انھوں نے بہت کچھ لکھا ہے، گیت نظموں اور غزلوں کے علاوہ دوہے بھی بہت خوبصورت لکھے ہیں اور جو معیار انھوں نے اپنی غزلوں نظموں اور انہی دیگر شعروں میں برقرار رکھا ہے، وہ ہر صنف میں قائم ہے۔ ندا فاضلی کی پرواز فکر کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ ان کے شعری مجموعہ کی اشاعت سے پہلے ہی انہیں ایک اہم جدید شاعر تسلیم کرلیا گیا تھا۔

ان کے منفرد موضوعات اور زندگی کے مختلف عنوانات پر جو نظمیں اور گیت پائے جاتے ہیں، وہ کسی دوسرے شاعر کے یہاں نظر نہیں آتیں، کتنے دن بعد ''راستے کی منطق'' اپنا گھر، مورناچ، دو کھڑکیاں، ہجرت، قاتل، پرائی آگ، مشورہ، پیدائش، ایک الجھن، خدا خاموش، جنگ، پھر یوں ہوا، سحر، دھوپ، شام، رنگ محل، سینکڑوں موضوعات ایسے ہیں، جن میں ندا فاضلی نے اپنی نظموں کو موضوع بنایا، اور ان میں ایک توانائی اور ایسے لہجے کو لیکر اردو ادب کے مشہور نقاد بھی متاثر ہوگئے۔ اب دیکھئے آگے پیش ہے ''مورناچ''۔

مورناچ

دیکھتے دیکھتے، اس کے چاروں طرف

سارنگوں کا ریشم بکھرنے لگا
دھیمے دھیمے کئی کھڑکیاں سی لگیں
پھڑ پھڑاتی ہوئی فاختائیں اڑیں
بدلیاں چھا گئیں
بجلیوں کی لکیریں چمکنے لگیں
ساری بنجر زمین ہر ہو گئی
ناچتے ناچتے مور کی آنکھ سے
پہلا آنسو گرا
خوبصورت سجیلے پروں کی دھنک
ٹوٹ کر ٹکڑا ٹکڑا بکھرنے لگیں
پھر فضاؤں سے جنگل برسنے لگا
دیکھتے دیکھتے، بدلیاں چھا گئیں

اسی طرح کے سینکڑوں موضوعات ہیں، جو ندا فاضلی کے موضوع نظم بنے اور زندگی کے مختلف رنگ آنکھوں کے سامنے آئے۔ فطرت کے مناظر ہوں یا موسم ہو، شہر، گاؤں، بھیڑ، گھر غرض کہ زندگی کا کوئی اہم پہلو بچتا نظر نہیں آتا۔ انور خان لکھتے ہیں:

''راستے گھر آنگن'' ہندوستانی مزاج موسم کا عکس ندا فاضلی کی شاعری کئی اہم موضوعات ہیں، مگر اس سے اہم عنصر جو انہیں اپنے نوع کے دوسرے شاعروں سے الگ کر دیتا ہے، وہ ہے ان کی شاعری میں آج کے عہد کے انسان کی ذہنی کشمکش کا اظہار شاید وہ بھی بہت سے شاعروں کی طرح اپنے بنائے ہوئے دائروں میں محصور ہو جاتے، مگر شہر کی ہنگامہ خیز پر آشوب زندگی نے انہیں ایک بڑے تجربے سے دوچار کیا، ہلکی پھلکی رومانی نظموں سے اب وہ انسان کو درپیش ذہنی رومانی مسائل پر گئے اور انہیں اپنے عہد کی محشر

رواداری کو انہوں نے محسوس کیا اور اس کا اظہار بھی کیا، اس تجربے نے انہیں اپنے معاصر شاعروں سے بھی مختلف بنایا ہے۔

سوال پوچھتے رہو

سروں پر آسمان تھا قدم قدم زمین تھی
دھواں دھواں آسماں زمین کھوگئی یہاں
سروں پہ آسماں تھا، قدم قدم زمین تھی
دھواں دھواں ہے آسماں، زمیں کھوگئی کہاں
برس رہی ہے تیرگی، نہ ہاتھ ہیں نہ پاؤں
نہ شہر نہ گاؤں ہیں، صدائیں ہی صدائیں ہیں
وطن چراغ خوف ڈر، عرب یہود، کینسر
چناب روس، چین، گھر
سینہ سفید بے لگام
تو کڑ ھائی ویت نام
سوال ہی حیات ہے، سوال کائنات ہے
سوال ہی جواب ہے، سوال انقلاب ہے
کوئی جواب دے نہ دے، سوال پوچھتے رہو

ندا فاضلی کی یہ وہ نظمیں ہیں جو ان کی مشہور کتاب ''مور ناچ'' میں شامل ہیں، یہ نظمیں ان کی شاعری کے عروج کے دور کی ہیں، اس لئے پہلا شعری مجموعہ ''لفظوں کا پل'' ہے اور ''مور ناچ'' دوسرا شعری مجموعہ ہے: ''لفظوں کا پل'' میں ان کی ابتدائی نظمیں ہیں، جب کہ ''مور ناچ'' میں سچ پوچھئے تو ان کے انتخاب شامل ہیں، یہی وجہ ہے کہ ''مور ناچ'' کی ہر نظم ایک شاہکار نظم ہے۔

''سوال پوچھتے رہو'' ان کی مشہور نظم ہے، جس پر بیشمار تبصرے کئے گئے ہیں،

ہندی کی مشہور ادیبہ ششی بھٹنا گر نے ''مورناچ'' پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے، یہاں ان کی کچھ اور نظمیں پیش ہیں جنہیں پڑھ کر اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ وہ اردو کے تمام شعراء سے کس قدر مختلف اور بلند ہیں۔

وہ لڑکی

وہ لڑکی یاد آتی ہے
جو ہونٹوں سے نہیں پورے بدن سے بات کرتی تھی
سمٹے وقت بھی چاروں دشاؤں میں بکھرتی تھی
وہ لڑکی یاد آتی ہے
وہ لڑکی اب نہ جانے کس کے بستر کی کرن ہوگی
ابھی تک پھول کی مانند ہوگی یا چمن ہوگی
تجیلی رات اب بھی جب کبھی گھونگھٹ اٹھاتی ہے
لچکتی کہکشاں جب ہنستے ہنستے ٹوٹ جاتی ہے
کوئی ایسی خوشبو بال کھولے مسکراتی ہے
وہ لڑکی یاد آتی ہے

ندا فاضلی کی پوری شاعری چاہے وہ نظمیں ہوں، غزلیں ہوں گیت ہوں یا دوہے ہوں، زندگی کی سچائیاں ہر صنف میں نظر آتی ہی اور اگر ان کی رومانی نظمیں پڑھی جائیں تو ان میں بھی ایک انفرادیت پائی جاتی ہے، ندا فاضلی نے اپنے تجربات اور محسوسات اپنی شاعری میں اس طرح سمودئے ہیں کہ وہ آج ہر دل کی دھڑکن معلوم ہوتے ہیں، ان کی زندگی میں بے شمار اتار چڑھاؤ آئے ہیں، زندگی کے مسلسل سفر میں جن تجربات اور مشاہدات سے وہ دوچار ہوئے وہ پوری طرح ان کی شاعری میں روشن ہیں، چاہے وہ رومانی نظمیں ہوں یا سیاسی نظمیں ہوں اور یہ بات طے شدہ ہے کہ جب تک ہم ان کی زندگی کے ایام پر روشنی نہیں ڈالیں گے، ان کے شعری کمالات ان کی خوبیاں نظر نہیں آئیں گی۔

جہاں ندا فاضلی نے اپنی زندگی کے بیشتر دن مصیبتوں اور تکلیفوں میں گذارے ہیں، وہیں ان کی زندگی عشق ومحبت کے نغموں سے بھی لبریز ہے، عشق ومحبت کی کئی داستانیں ان سے منسوب ہیں لیکن جس لڑکی سے ان کے عشق میں ایک انقلابی تبدیلی آئی، جس نے ان کی زندگی کا رخ بدل دیا ہے، وہ ہے گوالیار کی رہنے والی عشرت جس کا ذکر وہ کئی جگہ کئی طریقوں سے اپنی شاعری اپنی سوانح میں کر چکے ہیں۔

عشرت ان کے ذہن سے آج تک دور نہ ہو سکی، ظاہر ہے جو عشق کی زندگی انھوں نے گذاری، وہ سب ان کی شاعری میں آنا قدرتی بات ہے، اس بارے میں خود ندا فاضلی کی زبانی سنئے وہ لکھتے ہیں:

''فائن آرٹس کالج میں مقبول فدا حسین کے اعزاز میں ایک فنکشن ہے اور ندا بھی اس میں مدعو کیا گیا ہے، اس جلسے میں حسین اپنی تقریر کے بعد گجراتی لہجے میں اردو کے شعر سناتے ہیں اور ندا اپنی نئی نظمیں پڑھتا ہے، سننے والوں میں زیادہ تعداد کالج کی طالبات کی ہے، ندا کی گھریلو قسم کی نظمیں اپنی جزئیات اور شوخی کے کارن محفل کو جگاتی ہیں، ان لڑکیوں میں ایک لمبے قد کی اور چھریرے بدن کی لڑکی ندا کے پرانے گھر کے محلے کی ہے، اس کا نام عشرت ہے، یہ ندا کی بہنوں کی سہیلی ہے، اس کا باپ پولس میں سب انسپکٹر ہے اور ندا کو قرآن پڑھانے والی استادنی کا بڑا بھائی ہے، ندا عشرت کی عمر میں پانچ برس کا فرق ہے، یہ ہی وہ لڑکی ہے، جس نے ندا فاضلی کے ذہن پر اگہرا اثر ڈالا اور برسوں تک وہ نہیں بھلا پائے، وہ کسی نہ کسی روپ میں ان کی شاعری میں نظر آجاتی ہے، کبھی مسالہ پیستی ہوئی، کبھی وہ لڑکی کے روپ میں اور کبھی کسی اور روپ میں غرض کہ عشرت ان کے ذہن پر چھاتی رہی اور بغیر عشرت کا ذکر کئے ان کی سوانح حیات کو بغور پڑھئے، ان کی شاعری کا کھل کر جائزہ نہیں لیا جا سکتا ہے۔''

وہ آگے عشرت کے بارے میں لکھتے ہیں:

''کالج جاتے اور وہاں سے لوٹتے وقت عشرت روز ندا کے کمرے کے سامنے سے گذرتی ہے، اس کے گذرنے کا وقت اس کے آنے سے ایک ڈیڑھ گھنٹے پہلے سے شروع ہو جاتا ہے، ہاتھ کی گھڑی کی رفتار سست ہو جاتی ہے اور راستے کے سارے منظر دھندلے ہو جاتے ہیں، ندا اس وقت سارے کام چھوڑ کر اس کا انتظار کرتا ہے، وہ آتی ہے اور دیکھتے ہی دیکھتے گذر جاتی ہے، لیکن ندا اس کے آنے اور گذرنے کے یہ مختصر سے لمحے سامنے صرف اس کے جسم میں مہکتے رہتے ہیں، ان دوریوں کو پانے کے لئے عشرت نے اپنی ایک سہیلی کو ہم راز کیا ہے، اس کا نام وجیہ ہے، وہ پیغام رسانی کے ساتھ دونوں کو ملانے کا نیک فرض بھی نبھاتی ہے۔''

وہ عشرت سے زیادہ تجربہ کار ہے، عشرت کو اس وادی میں قدم رکھے ابھی مشکل سے پانچ چھ مہینے ہی ہوئے ہیں، جبکہ وہ عشق کے کئی موسموں سے گزر چکی ہے، ندا فاضلی کی زندگی کے یہ واقعات پڑھ کر اگر ان کی نظم ''وہ لڑکی'' پڑھی جائے تو کچھ اور ہی لطف دے گی۔

ان کی ہر نظم ایک مشاہدہ ایک تجربہ ہے اور وہ جب اپنے منفرد انداز بیان سے کہیں سے کہیں پہنچا دیتے ہیں، یہ ایک اپنے موضوع کی منفرد نظم ہے دیکھئے

''**پہچان**'' ہاجرہ بیگم کے نام

نہیں یہ بھی نہیں
یہ بھی نہیں
یہ بھی نہیں—وہ تو
نہ جانے کون تھے
یہ سب کے سب تو میرے جیسے ہیں

کبھی دھڑکنوں میں ننھے ننھے چاند روشن ہیں
کبھی میری طرح سے وقت کی بھٹی کے ایندھن ہیں
جنھوں نے میری کٹیا میں اندھیری رات میں گھس کر
میری آنکھوں کے آگے
میرے بچوں کو جلایا تھا
وہ کوئی اور تھے
وہ چہرے تو کہاں اب ذہن میں محفوظ جج صاحب
مگر ہاں!
پاس ہوں تو سونگھ کر پہچان سکتی ہوں
وہ اس جنگل سے آئے تھے
جہاں کی عورتوں کی گود میں
بچے نہیں ہنستے

ندا فاضلی کی یہ وہ مشہور نظم ہے، جو ان کے شعری مجموعہ ''مورناچ'' میں شامل ہے۔ جو ہاجرہ بیگم کے نام ہے۔

جلگاؤں کے فساد میں ہاجرہ بیگم کے چار بچوں کو فسادیوں نے زندہ جلا دیا تھا، آج ہر روز ایک ہاجرہ جلائی جاتی ہے، اور یہ نظم ہر اس ہاجرہ بیگم کی یاد دلاتی ہے، جو دن رات اپنے بچوں کو زندہ جلتا دیکھتی ہیں، چاہے وہ بھاگلپور ہو، جمشید پور یا کہ کانپور، میرٹھ کی ہو، آج ہر شہر میں کسی نہ کسی ہاجرہ بیگم کے بچوں کو جلایا جاتا ہے۔ اور پھر گجرات میں تو کئی ہاجرائیں جلا دی گئی ہیں۔

ندا فاضلی کی یہ وہ زندہ شاعری ہے، جو ہمیشہ زندہ رہے گی، جب تک ملک میں کسی بہن ہاجرہ بیگم کے بچوں کو جلایا جاتا رہے گا، ندا فاضلی کی نظم ہمیں خون کے آنسو رلاتی رہے گی، اس نظم کے بارے میں ندا فاضلی ایک انٹرویو دیتے ہوئے فرماتے ہیں، جلیل

بازید پوری کے ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے۔ سوال: کس قسم کے واقعات سے آپکو تحریک ملتی ہے، اس سوال کا جواب ندا فاضلی نے اس طرح دیا ہے۔

''یہ موڈ اور مزاج پر منحصر ہے، کبھی بڑے سے بڑا حادثہ بنا اثر کئے گذر جاتا ہے اور کبھی راستہ کاٹتی ہوئی بلی بھی ذہن پر حاوی رہتی ہے، مجھے عام طور سے شام کا آسمان، تنہائی کا سمندر، کھڑکی کی چھتیں، دھوپ دوپٹوں کے رنگ اور درختوں پر کھدے نام شکستہ پرانی عمارتیں انجانے جنگلوں کے پھول روشنی پر روتی ہوئی آنکھیں، ملتے ہوئے ہاتھ، بہنوں کی باتیں، بچوں کی شرارتیں، ہنستے ٹوٹتے رشتے آنکھوں کی چہل پہل دور کر فیوز دہ متاثر کرتی ہیں۔

لیکن تخلیقی عمل میں کونسا تاثر کسی مشکل پیرایہ میں ڈھل جاتا ہے، اس کی نشاندہی مشکل ہے، مثال کے طور پر ''مورناچ'' میں ''میری ایک اہم پہچان'' کے عنوان سے ہے، یہ نظم میں نے ہاجرہ بیگم کے نام منسوب کی ہے، جن کے چار بچے جلگاؤں کے فساد میں زندہ جلا دئے گئے تھے، اس حادثے کی خبر میرے ذہن میں کی دنوں سے پڑی ہوئی تھی، ایک دن دوپہر کے وقت کسی کام سے مکتبہ جامعہ جو بھنڈی بازار میں ہے، گیا تو جیسے ہی میں نے کار روکی، تو سارے لوگوں کو بھاگتے ہوئے دیکھا، پتہ لگا وہاں کہیں گولی چل رہی ہے۔ میں گاڑی موڑ کر ایک گلی میں ایک پہچان کی دوکان میں چلا گیا، وہ مجھے دیکھتے ہی حیران ہوا کہ مجھے فوراً گھر واپس لوٹنے کو کہا لیکن لوٹنے پر مجھے تعجب ہوا کہ راستے میں شعوری طور پر جو نظم میرے ذہن میں متشکل ہو چکی تھی، اس کا تعلق میرے اپنے خوف کے بجائے ہاجرہ بیگم کے اس المیہ سے تھا، جسے میں نے اخبار کی خبر کی صورت میں پڑھا تھا اور بجائے ظاہر میں بھول چکا تھا، درد سے درد کا رشتہ تخلیقی صورت میں ''پہچان'' نظم کا عنوان بن گیا اور بھی نظمیں کہیں ہیں، جو اردو شاعری میں اپنی نوعیت کی منفرد نظمیں ہیں''۔

پھر ہوئی شام

پھر ہوئی شام
ستارے جاگے
نیم کی شاخ میں الجھا ہوا چاند
جھیل کے ٹھہرے ہوئے پانی میں، لہرانے لگا
وقت ایک جنگلی کبوتر کی طرح
جسم کی قید میں گھبرانے لگا
راستے بجنے لگے
ذہن میں سویا ہوا صدیوں پرانا جنگل
سرد تنہائیاں برسانے لگا
درد پھیلانے لگا
سوکھے شہر کے منظر سارے
ساتھ چلتے ہوئے لوگوں کے شناسا چہرے
آپ بدلنے لگے ویرانوں میں
پھر ہوئی شام
بڑھتی دوریاں پہچانوں میں
پھر ہوئی شام ستارے جاگے

ڈاکٹر محمد حسن لکھتے ہیں:

''ندا فاضلی کی شاعری مقدس نا آسودگی کی شاعری ہے، شہروں کی صنعتی زندگی سے نوجوانوں کی نفرت و محبت والے رشتوں کی شاعری ہے، جس میں انسان اپنی تکمیل کے سفر میں قدم قدم پر دوچار ہوتا ہے، ندا شہری زندگی کے تشنج سے پیدا ہونے والی بے چہرہ اور بے رحم تہذیب کی مشن تیز رفتاری اور

ثقافت سے بیزار ہیں کہ یہ ان سے جینے کی سری لذت رشتوں کی نرمی اور شائستگی چھنتی نہیں ہے، وہ اندھی دوڑ میں کچل جانے والی شخصی مسرت اور نجی لذتوں کے ماتم گسار ہیں۔''

ندا فاضلی کی شاعری میں زندگی کی وہ تمام سچائیاں اپنی پوری معنویت کے ساتھ نظر آتی ہیں، زندگی کو انھوں نے بہت قریب سے دیکھا ہے اور گہرے مشاہدے اور تجربات کو اپنی شاعری میں سمو دیا ہے، چاہے وہ دوہے ہوں یا گیت ہوں، نظمیں، غزلیں ہوں یا نثر ہو، وہ ہر جگہ اپنے تجربات اور مشاہدات کو اجاگر کرنے کے فن سے خوب واقف ہیں، ڈاکٹر محمد حسن ایک جگہ لکھتے ہیں:

''اپنے ادبی سماج میں جہاں احساس و اظہار دو دھڑوں میں تقسیم ہو گیا ہے، ایک مہملیت اور انحطاط پسند انفرادیت کی لہر ہے اور دوسرے پر ہنگامی معاملات پر سطحی نعرہ بازی کی اجارہ داری، ندا فاضلی انسان کو ذات اور انسانی رشتوں کی لذت سے محروم کر دینے والے معاشرے کے ماتم گسار ہیں، اسی کرب کو شاعری میں ڈھالتے ہیں۔ یہ خوبی شاعری نہیں ہو سکتی کہ تجربے کے بطن سے ہوتی ہے، محض ذات کی شاعری نہیں ہو سکتی کہ اس کے جلو میں پورا معاشرہ اور اس کا مسخ شدہ کردار جلوہ گر ہے، یہ شاعری ہی کی تیسری آواز ہے، جو دونوں کو اپناتی بھی ہے اور دونوں کو ٹھکراتی بھی ہے کہ اس نے ذات اور کائنات کے باہمی رشتوں کا ادراک فیشن اور فارمولے سے نہیں کیا، ذاتی تجربے سے کیا ہے، ان تجربوں میں نعرہ بازی ہے نہ ہنگامی واقعات سے گریز، جنگ اور پہچان جیسی نظمیں بھی ہیں، جو ہندو پاک لڑائی اور باجرہ بیگم کی زبانی جل گاؤں کے فرقہ وارانہ فسادات کے تجربے سے گذرنے کے بعد کہیں گئیں، نہ اس قسم کی مہمل اور مریضانہ کیفیت میں ڈوبنے کی بیماری ہے، جس نے ہماری شاعری کے بیشتر حصے کو چیستاں بنا دیا ہے۔''

یہاں چند نظمیں پیش کی جارہی ہیں، جو شہری زندگی کے مسائل خاص طور پر بڑے شہروں کی زندگی کے بارے میں اپنے تجربات کے کی روشنی میں ملاحظہ فرمایئے۔

بمبئی

یہ کیسی بستی ہے
میں کس طرف چلا آیا

فضا میں گونج رہی ہیں ہزاروں آوازیں
سلگ رہی ہیں فضاؤں میں ان گنت سانسیں
جدھر بھی دیکھو
کھوے، کولھے، پنڈلیاں، آنکھیں
مگر کہیں کوئی چہرہ نظر نہیں آتا

یہاں تو سب ہی بڑے چھوٹے
اپنے چہروں کو
چمکتی آنکھوں کو، گالوں کو، ہنستے ہونٹوں کو
سروں کو خول سے باہر نکال لیتے ہیں
سویرے اٹھتے ہی جیبوں میں ڈال لیتے ہیں
عجیب بستی ہے
اس میں نہ دن، نہ رات، نہ شام
بسوں کی سیٹ سے سورج طلوع ہوتا ہے
جھلتی ٹین کی کھولی میں چاند سوتا ہے

یہاں تو کچھ بھی نہیں، ریل اور بسوں کے سوا
زمیں پہ رینگتے بے حس سمندروں کے سوا
عمارتوں کو نگلتی عمارتوں کے سوا
یہ قبر قبر جزیرہ کسے جگاؤ گے
خود اپنے آپ سے الجھو گے ٹوٹ جاؤ گے

بڑے شہروں کی بیماریاں بھی بڑی ہوتی ہیں، یہاں کوئی کسی کا یار نہیں ہوتا، کسی کو کسی ایک دوسرے کے غم میں شریک ہونے کی فرصت نہیں ہوتی، دوستی رشتے یہاں کچھ کام نہیں آتے، اس پوری نظم میں ندا فاضلی نے بمبئی شہر کی پریشانیوں کا ذکر اپنے فنکارانہ انداز سے کیا ہے اور تجربات اور مشاہدے کی بھرپور ترجمانی کی ہے۔ ندا فاضلی چونکہ ایک اہم جدید شاعر ہیں اور انہیں جدید شاعری میں نئی نئی لفظیات اور نئے نئے استعاروں کے ذریعہ بات کہی جاتی ہے۔ اور یہ ہنر ندا فاضلی خوب جانتے ہیں یہ ہی وجہ ہے کہ وہ اپنی پوری شاعری میں علامتوں اور استعاروں کے ذریعہ بڑی بات یوں کہہ جاتے ہیں جیسے ہم تم باتیں کرتے ہیں اور روزمرہ بولی جانے والی زبان میں علامت نگاری ایک بہت بڑا فن ہے، جو اساتذہ کے کلام میں بھی پایا جاتا ہے۔ غالب، میر، اقبال کے یہاں بھی موجود ہے، لیکن اس ہنر میں ہر شاعر کمال حاصل کر نہیں پاتا، علامت نگاری کے بارے میں کوئی نیا تصور نہیں ہے، لیکن علامت پسندی یا نئی علامت نگاری کا تصور ضرور دیتا ہے، کیونکہ یہ نئے ادب یا نئی شاعری سے متعلق ہے، عموماً علامت نگاری کو ادبی یا شعری اظہار کا ایک اسلوب خیال کیا جاتا ہے، علامت پسندی بھی اظہار کا ایک اسلوب ہی ہے لیکن اسکا مفہوم عمومی علامت نگاری سے پیچیدہ تر اور تخلیقی عمل میں اس کو برتنا اعلیٰ فن نکات کا مقام ہے، دنیا کے دیگر ادب میں علامت نگاری باقاعدہ تحریک کے روپ میں ظہور کر چکی ہے، جیسا کہ بالکل ابتدا میں کہہ چکا ہوں، ہمارے ادب میں فنی نکات کو تحریک کا درجہ نہیں دیا گیا، اس لئے علامت نگاری چاہے وہ نئی ہو یا پرانی ہمارے ادب میں فن اسلوب ہونے تک ہی محدود رہی، یہ

بات کسی حد تک ادبی وقعت کے درجے کو پہنچتی ہے، ورنہ جس وقت غالب نے ناز وغمزہ کو دشنہ وخنجر اور مشاہدہ حق کی گفتگو کو بادہ وساغر کی زباں میں ادا کرنا شروع کیا تھا، سطحی علامت نگاری ہمارے یہاں بھی علامت پسندی کا روپ اختیار کرنے لگی تھی، اور آج صورت حال یہ ہے کہ اگرچہ ہماری شاعری میں علامت پسندی کوئی باقاعدہ تحریک نہیں، اس کے باوجود تقریباً ہر شاعر کے یہاں مختلف انھونی علامت مل جاتی ہے اور علامت پسندی کی یہ عمومیت ہی جس نے اسے جدید شعری روایت کا ایک حصہ بنایا ہے۔

ندا فاضلی نے بھی اپنی شاعری میں نئی نئی علامتوں کا استعمال کیا ہے اور علامتوں کے ذریعہ اپنی نظموں غزلوں میں تہہ داری اور معنویت میں اضافہ کیا ہے، یہی وجہ ہے کہ ان کی نظمیں دیگر شعراء کی نظموں کے مقابلے میں زیادہ بڑی اور گہرائی لئے ہوئے ہوتی ہیں، یہاں ایک نظم پیش ہے، جو اپنی نوعیت کی منفرد نظم ہے۔

خود کشی

کیا خوب آدمی تھا بلا کا ذہین تھا
کہتا تھا ماں کی گود سے تاریک قبر تک
اک راستہ ہے
جس پہ چلے جا رہے ہیں ہم
پہیئے پہ چڑھ چکے ہیں ہم
گھسے جا رہے ہیں ہم
الجھا رہا وہ ذہن کے اندر تمام عمر
ہر نیا پل نیا سوال تھا
جینا وبال تھا
محدود ہو کے سوچنا
اسکو محال تھا

لیڈر بنا

نہ چور

افسوس جیسے آیا تھا ویسے ہی چل دیا

ہر قد کو ناپتا تھا یہی اس کا عیب تھا

کمبخت کو یہ عیب چھپانا نہ آسکا

لوگوں کو بے وقوف بنانا نہ آسکا

کیا خوب آدمی تھا

اس نظم میں ندا فاضلی کی ذہانتیں پوشیدہ ہیں ، ان کا حساس ہونا ذہین ہونا ، ان کے لئے کتنا برا ہو گیا کہ وہ زندگی کے ہر موڑ پر اپنی مصیبت کو ہنس کر جھیلتے رہے اور ماں کی گود سے بڑے ہونے تک تنہا تنہا دکھ جھیلتے جھیلتے اس مقام تک آ گئے اور اپنی تنہائیوں میں کسی کو شریک بھی نہیں کر سکے ، یہی تنہائی کا احساس ان کی غزلوں میں نظموں میں جگہ جگہ نظر آتا ہے ۔ وہ سب کو ہنساتے ہیں لیکن وہ خود اندر سے روتے ہیں اور دکھاوے کی ہنسی ایک دھوکا ایک فریب ہوتی ہے ایک نظم دیکھئے ۔

لاپتہ

میں یہاں آیا تھا ، میرے سارے دوست جانتے ہیں

قہقہے میرے ابھی تک ، ہوٹلوں میں محفلوں میں

میکدوں میں ، سوکھے پھولوں کی طرح بکھرے پڑے ہیں

مدتوں سے ، بھٹکتا پھر رہا ہوں

کس سے پوچھوں ، میں کہاں ہوں

آگ اگلتے سنگ دل سورج نے

مجھ کو قتل کر کے

گیہوں بوئے کھیت میں دفنا دیا ہے

اب تمہاری یاد بھی شاید نہ مجھ کو ڈھونڈ پائے

میں یہاں آیا تھا

ہندی کے مشہور ادیب ڈاکٹر شانی ندا فاضلی کے شعری مجموعہ ''مورناچ'' کے فلیپ پر لکھتے ہیں، جو ابھی کچھ دن پہلے دیوناگری میں شائع ہوا ہے:

''اردو کی نئی شاعری کی سب سے بڑی خوبی اور پہلی شناخت یہ ہے کہ اس نے فارسی کی علامتوں سے اپنا پیچھا چھڑا کر اپنے آس پاس کو دیکھا، اپنے اردگرد کی آوازیں سنیں اپنی ہی زمین سے اکھڑتی جڑوں کو پھر سے جگہ دے کر میراجی، اخترالایمان، جاں نثار اختر، جیسے کویوں سے اپنا نیا ناطہ جوڑا، اس نے غالب کا بیدار ذہن میر کی سادہ گوئی اور جاں نثار اختر کی بے راہ روی لی اور بالکل اپنی آوازیں اپنے ہی وقت کی عبارت لکھی، ایسی عبارت جس میں آنے والے وقتوں میں دھمک تک سنائی دیتی ہے، یہ سنیوگ کی بات نہیں ہے اردو کے کچھ جدید شاعروں نے ہندی اور اردو کی دیوار کو ڈھا کر رکھدیا، اور ایسے جدیدیوں میں ندا فاضلی کا نام سب سے پہلے لیا جائے گا۔''

یہاں ندا فاضلی کی کچھ ایسی نظمیں پیش کی جارہی ہیں، جو ہندی اور اردو کا امتزاج ہیں۔

کھیل

آؤ

کہیں سے تھوڑی سی مٹی بھر لائیں

مٹی کو بادل میں گوندھیں

نئے نئے آکار بنائیں

کسی کے سر پہ چٹیا رکھ دیں

ماتھے اوپر تلک سجائیں

کسی کے چھوٹے سے چہرے پر
موٹی سی داڑھی پھیلائیں
کچھ دن ان سے جی بہلائیں
اور یہ جب میلے ہو جائیں
داڑھی چوٹی تلک سبھی کو
توڑ پھوڑ کے گڈ مڈ کر دیں
ملی جلی یہ مٹی پھر سے
الگ الگ سانچوں میں بھر دیں
نئے نئے آکاش بنائیں
داڑھی میں چوٹی لہرائے، چوٹی میں داڑھی چھپ جائے
کس میں کتنا کون چھپا ہے
کون بتائے

ندا فاضلی کی شاعری میں ہندی کے خوبصورت لفظوں کا انتخاب بڑے سلیقے سے کیا جاتا ہے اور یہی نہیں کہ صرف لفظوں کا انتخاب ہوتا ہے بلکہ ان کی نظموں میں ایک آفاقیت ہوتی ہے، مفہوم میں گہرائی اور وسعت کے علاوہ لہجہ میں ایک انفرادیت ہندی کے خوبصورت رچے بسے الفاظ کے استعمال ہی کی وجہ ہے کہ ان کی شاعری ہندی اور اردو دونوں طبقوں میں مقبول ہے، یہی وجہ ہے کہ شروع شروع میں ہندی کے رسائل میں ان کا کلام برابر چھپتا رہا اور ابھی حال ہی میں ان کی مشہور کتاب ''مورناچ'' دیوناگری میں شائع ہوئی، جس پر تبصرہ کرتے ہوئے ہندی کی مشہور ادیبہ ششما بھٹناگر لکھتی ہیں:

''ندا فاضلی کا ہندی میں پرکاشن پہلا سنگریزہ ''مورناچ'' پاٹھکوں کے سامنے ہے اس میں اب تک پرکاشت تین سنگرہوں کی پرتی ندھی رچنائیں سنکلت شامل ہیں، ہندی اتھوا دیوناگری میں اردو کی غزلوں اور نظموں کا آنا

بہت اچھا ہے اور ضروری بھی ہیکو یتا کے نام پر کچھ کچھ لکھنے والوں نے شستہ
غزل کی زمین پر قدم بڑھانے شروع کئے تھے، ان کے لئے مورناچ پڑھ کر یہ
سمجھنا آسان ہو جائے گا کہ اس فارم میں کچھ دشت آنترک خاص گڑ (خوبیاں
) ہوتے ہیں، اسمبندھتا غیر جانبداری میں بھی ایک نارتم (سلسلہ) یا لگاؤ ہوتا
ہے، جو ستیہ پوچھو (الفاظ کے خزانے) سے نہیں بلکہ بھیتر کی کویتا سے بنتا ہے
کیول ہندی کے اردو پاریئے (ملتے جلتے) ردیف قافیوں پر و دینے بھر سے
غزل اتپادن کا ڈھونگ نہیں چل سکتا۔''

بلاشبہ ندا فاضلی اردو شاعری کے خاص طور سے اور نظم کے ایک بڑے شاعر تسلیم
کئے جاتے ہیں، انہوں نے اردو شاعری کو بہت کچھ دیا اور یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ آپ آج کے
دور کے وہ اہم شاعر ہیں۔

ندا فاضلی کی غزلیں

روایتی غزل کے متعلق کچھ لکھنے سے پہلے یہ سمجھ لیا جائے کہ غزل کی روایت کیا ہے، ظاہر ہے کسی بھی صنف کی روایت اس کی ابتدا ہوتی ہے اور غزل کی روایت فارسی سے ماخوذ ہے اور اردو میں محققین کا کہنا ہے، غزل کی روایت قلی قطب شاہ سے شروع ہوتی ہے، نئی تحقیق کے مطابق غزل کی روایت چند غزلوں کی شکل میں امیر خسرو سے ہے، بہر کیف جو بھی ہو ہمیں صاف ستھری اور منجھی ہوئی غزل ولی دکنی کے یہاں ملتی ہے اور ہم یہ بات ماننے سے قاصر ہیں کہ اردو غزل کی روایت ولی سے شروع ہوئی۔

ولی کے بعد غزل کو جمالیات کی اور حسن و بیاں کی خوبیوں سے آراستہ کیا ہے، میر تقی میر نے اور وہی اردو غزل کے بابائے اردو کہلائے، آج بھی میر کا کلام مستند مانا جاتا ہے غزل کی روایت اس کے بعد عہد بہ عہد نئی شکلیں نئے رنگوں نئے آہنگوں اور نئی لفظیات کے ساتھ ترقی کرتی رہی ہے۔ جس پر ہر نئے لکھنے والے کی اساس قائم ہے اور نئی غزل کا سلسلہ غالب کے عہد تک رہا ہے۔

لیکن یہ بات یاد رہے کہ غالب کی غزل روایتی غزل نہیں تھی، غالب نے ہر عہد کی غزل کو اس کی روایت کو توڑ کر اردو غزل کو ایک نیا لہجہ، نئی فکر دی، جو غزل کی روایت ہیئتی اعتبار سے عبارت تھی، لیکن غالب نے غزل کے لئے ایک الگ راہ نکالی تھی، غالب کے زمانے میں اور اس کے بہت بعد تک غالب نئی غزل کے ساتھ ساتھ روایتی غزل کی چادر بہت دور تک پھیلی رہی، روایتی غزل کو فروغ دینے والوں میں مومن اور استاد ذوق کے علاوہ سب سے بڑا اور اہم رول ادا کیا ہے، داغ دہلوی جیسے اپنی طرز کے ہزاروں شاعر پیدا

ہوئے، داغ اسکول کے نام سے شعراء ہوئے اور آج جدید ہندوستان میں بھی ہزاروں لاکھوں اپنی ہٹ پر قائم شعراء روایتی غزل ہی کہہ رہے ہیں۔

حالانکہ نہ وہ غزل کو کچھ دے پا رہے ہیں اور نہ ہی غزل کی اس بھیڑ میں غزل کی خوبصورت روایت سے ہٹ کر ہمیں اقبال، جوش اور فراق نے یہاں روایت کا احترام کرتے ہوئے غزل نئے ڈھنگ اور ترقی یافتہ شکل میں ملتی ہے، یہ شعراء بھی غزل کی روایت یا روایتی غزل سے پوری طرح اپنا دامن نہیں چھڑا سکے۔

نئی غزل کی ابتدا ہمارے ملک میں ترقی پسند تحریک سے شروع ہوتی ہے، جس کا آغاز ۱۹۳۶ء میں ہوا، دور اول نئی غزل کی ابتدا روایتی غزل کا ردعمل نہیں کہا جا سکتا نہ تو یہ روایت شکن کے طور پر پیدا ہوئی اور نہ ہی پرانی غزل سے کوئی دشمنی تھی، یہ وقت کا تقاضا تھا ملک آزاد ہونے کے لئے کروٹیں بدل رہا تھا اور آزادی کی اسی تحریک میں ملک کے دیگر عناصر کے ساتھ ساتھ شعراء اور ادباء بھی اس لڑائی میں شریک ہو گئے تھے اور ایک خاص مقصد کے لئے لکھا گیا ادب تحریک کی شکل میں ابھرا، ظاہر ہے کہ وہ اپنے ماضی سے قطعی مختلف ہوگا اور ایسا ہوا بھی نظم کی طرح غزلوں کے اشعار بھی مخصوص موضوع پر کہے جانے لگے، قاتل کے حالات مقتول سے ہمدردیاں، حب الوطنی کا جذبہ غیر ملکی حکمرانوں کے ملک سے نکالنے کی باتیں تک غزل میں دہرائیں ترقی پسند تحریک کی بنیاد صرف ملک کی آزادی ہی نہیں تھی، ملک میں کمیونسٹ نظام قائم کرنا تھا اور اقتصادی نظریات ایک حربے کے طور پر ترقی پسندوں نے نظموں کے علاوہ غزلوں میں بھی اپنائے، غزل کا چہرہ ایک دم بدلا ہوا دکھائی دینے لگا۔

ان ترقی پسند شعراء میں جو کامیاب شاعر ہوئے انہوں نے نظمیں بھی لکھیں اور غزلیں بھی ان میں سرفہرست فیض احمد فیض، سردار جعفری، مخدوم محی الدین، مجاز لکھنوی، اختر الایمان، کیفی اعظمی، جاں نثار اختر وغیرہ ہیں۔ اس سلسلے میں وزیر آغا لکھتے ہیں:

''ولی سے غالب تک کا دور اردو غزل کے فروغ کا زمانہ ہے، اس

میں اردو غزل گیت اور نظم دونوں کے تسلط سے آزاد ہے، گیت سے اس دور کے شعراء نے شعوری طور پر انحراف کیا، البتہ نظم سے متصادم ہونے کی انہیں ضرورت ہی پیش نہیں آئی چنانچہ اس سارے عرصے میں غزل ہی اردو کی اہم ترین صنف ہے اور اسے اپنی بقا کے لئے خود کو کسی نئی صورت حال کے مطابق ڈھالنے کی فکر دامن گیر نہیں، پھر بھی چونکہ اردو غزل نے اپنی ساری روایت فارسی غزل سے مستعار لی تھی اس لئے قدرتی طور پر اس نے تلمیحات ا ستعارات، تراکیب اور خیال کے مخصوص پیکر بھی وہیں سے مستعار لئے اور انہیں کام میں لاتی رہی، پھر انیسویں صدی کے آغاز ہی میں ہندوستان کی فضا میں انقلابی تبدیلیاں فوراً ہونا شروع ہو گئیں۔

اجنبی حکومت کے تسلط اور مغربی تہذیب اور ادب کے نفوذ نے اذہان کو متحرک کر دیا، تحفظ ذات کا جذبہ بھی سطح پر آ گیا اور ساری ہندوستانی قوم ذہنی طور پر متحرک ہو گئی، انیسویں صدی نے ہندو اور مسلمان دونوں کے یہاں ذہنی سیاسی اور ثقافتی ابال کے منشور ملتے ہیں، ظاہر ہے کہ اس ابال کو پیش کرنے کے لئے غزل کے پامال تصورات اور علامتیں ناکافی تھیں، اور نئی فضا کشادگی اور وسعت کا تقاضا کر رہی تھی، اس تقاضے کا پہلا علم بردار غالب تھا کہ وہ اپنے بیان کے لئے کچھ اور وسعت کا طالب ہونے کے ساتھ ساتھ غزل کے ظروف کی تنگ دامانی کا بھی شکوہ سنج تھا، پھر یہ بات صرف غالب تک ہی محدود نہ رہی بلکہ اس زمانے کے تمام اذہان بھی محسوس کرنے لگے کہ نئی صورت حال سے نپٹنے اور نئے سماجی اور اساسی شعور کو گرفت میں لینے کے لئے غزل اپنی فاتح حیثیت میں قطعاً ناکافی تھی، چنانچہ غدر کے بعد مولانا حالی نے مقدمہ شعر وشاعری لکھی اور غزل کے موضوعات میں لچک اور وسعت کا مطالبہ کیا، تو اس کے پس پشت یہی بنیادی جذبہ کارفرما تھا، اس سے بعض حلقوں میں یہ خیال بھی

پیدا ہوا کہ غزل بجائے خود ایک کمزور صنف ہے اور اس کے مقابلے میں نظم کی حیثیت بدرجہا زیادہ ہے۔ لیکن یہ خیال اس لئے غلط تھا کہ نئے حالات میں قصور غزل کا نہیں بلکہ اس الجھاؤ کا تھا، ڈیڑھ سو برس تک ایک خاص قسم کی تلمیحات استعارات اور علامات سے اظہار ذات کا کام لیا تھا اور اب زمانے کی ایک ہی کروٹ نے انہیں زنگ آلود اور فرسودہ قرار دے دیا تھا۔

حالی کو اس صورت حال کا شدید احساس ہوا اور اس نے غزل کی صنف پر نہیں بلکہ غزل کے اس تقلیدی اور میکانکی انداز پر اعتراضات کئے جو انیسویں صدی میں عام ہو چکا تھا، فی الواقعہ اردو غزل کی تاریخ میں یہ پہلا موقع تھا کہ اسے ایک نازک صورت حال کے پیش نظر اپنی بقا کے لئے داخلی قوت اور لچک کو بروئے کار لانے کی ضرورت محسوس ہوئی، دیکھنا یہ ہے کہ غالب سے اقبال تک اس دور میں اردو غزل نے کس حد تک اپنی علمی داخلی قوت کو استعمال کیا اور اپنی بقاء کے لئے خود کو کس حد تک ایک نئے پیکر میں ڈھالا، نیز یہ کہ اس اقدام سے کہیں اس کا اصل مزاج تو مجروح نہیں ہوا؟

حالی کے بعد غزل نے ایک نئی کروٹ لی اور غالب نے اسے نیا روپ دیا، غزل اب عشق و محبت کے دائرے سے نکلی، زندگی کے مسائل کی طرف لوٹنے لگی، حالی سے اقبال تک آتے آتے غزل نے استقلالی صورت اختیار کر لی اور زندگی کے مسائل سے جڑتی گئی، حالی اور سرسید تحریک نے غزل کو ایک نئی زندگی دی اور غزل ایک بار پھر اپنی انقلابی صورت میں نمودار ہوئی، ترقی پسند شعراء نے اردو غزل کو ایک نئے موڑ پر لا کھڑا کیا اور زندگی کے مقاصد اور مسائل سے ہم کنار کیا، جن میں فیض احمد فیض، احمد ندیم قاسمی، علی سردار جعفری، جذبی، وامق جونپوری، کیفی اعظمی، جاں نثار اختر وغیرہ نے غزل میں وہ سب کچھ سمو دیا، جس کی وہ مستحق تھی، ترقی پسند شعراء نے نئی غزل کو ایک نئی زندگی

بخشی، بلکہ پورے اردو ادب کو متاثر کیا ہے، سیکڑوں برس پرانی روایات کو توڑ کر اس میں ایک نئی روح پھونکی۔''

پروفیسر آفتاب شمسی لکھتے ہیں:

''ترقی پسند تحریک کے آغاز ہی سے نظم کو فروغ ہو رہا تھا اور بیشتر ناقدین غزل کو اعجاز اور فتوحات کی علامت بتا رہے تھے، لیکن یہ وہی اشخاص تھے، جو غزل کی تہہ داری سے نا آشنا تھے، مجروح، ساحر، وامق، جذبی اور فیض نے غزل کو ترقی پسند اقدار سے روشناس کرایا، بالخصوص فیض نے عصری آگہی اور اس سیاسی صنف کو غزل کا موضوع بنایا، جس سے وہ کئی سال تک برسر پیکار رہے۔ آزادی کے بعد غزل نے نئے لہجے اور محاورہ کے ساتھ ساتھ کروٹ لی اس لئے غزل کی زبان کئی سو سال کے استعمال سے اب بے جان نظر آنے لگی تھی، اور اس کے رموز علائم معنویت کھوتے جا رہے تھے، انکشاف ذات اور فرد کائنات کے درمیان نئے رشتوں کی دریافت نے بیسویں صدی کی ساتویں دہائی میں ایک نئے طرز احساس کو جنم دیا، جس کی بدولت ساری اردو شاعری او ربالخصوص اردو غزل ایک نئے ذائقے سے آشنا ہوئی دیکھتے ہی دیکھتے غزل کے علائم اور استعارات کچھ سے کچھ ہو گئے۔''

بقول خلیل الرحمن اعظمی:

''ولی سے لیکر فراق تک جو غزل ارتقائی منزل طے کرنے کے باوجود ایک مخصوص لہجے سے ہم آہنگ تھی، چند ہی برسوں میں شب خون تحریک ''آہنگ'' کتاب ضیا وشعور وحکمت جیسے رسالوں نے اس رنگ کو اس طرح اجاگر کیا کہ قدیم رنگ غزل کے شیدائی بھی اس کی بے پناہ مقبولیت پر حیران رہ گئے۔''

چونکہ ہمارے موضوع کا تعلق اس دور کے سب سے اہم جدید شاعر ندا فاضلی

سے ہے، اس لئے بہتر ہوگا کہ کچھ جدید شاعری کے بارے میں بات کر لی جائے۔ خلیل الرحمن اعظمی لکھتے ہیں:

"جدید غزل ہمارے نزدیک غزل کی وہ صورت ہے، جو یگانہ فراق اور شاد عارفی کی غزل کے ۱۹۵۰ء کے بعد آنے والی نسل کے یہاں پہلے ابھرنا شروع ہو گئے۔"

جدید غزل کے بارے میں یوں تو بے شمار نقادوں نے اپنی اپنی رائے کا اظہار کیا ہے، جس کے لئے کئی صفحات درکار ہوں گے۔

پھر بھی چند قائدین کی رائے یہاں پیش ہے، جن کی رائے سے جدید شاعری یا جدید غزل کو سمجھنے اور جدید تحریک کے ارتقاء پر کچھ روشنی پڑ سکتی ہے۔

ڈاکٹر وزیر آغا لکھتے ہیں:

"نئی نسل پر ترقی پسند تحریک نے جو اثرات مرتب کئے، مثبت اور منفی نوعیت کے تھے، سب سے اہم ترین اثر یہ تھا کہ نئی نسل نے معاشی ناانصافی کے مسئلے کو بھی انسانی اخلاقیات کے دامن میں سمیٹ لیا، انسانی اخلاق کی مروجہ صورت یہ ہے کہ اگر کوئی شخص قتل کا ارتکاب کرے یا کسی کے مال پر اس کی توہین کرے، یا ایک طبقہ دوسرے طبقے کو پسماندہ رکھے، چونکہ ان اعمال کو ازمنہ قدیم ہی سے معاشرتی تحفظ حاصل رہا ہے، لہٰذا انھیں بالعموم اخلاقی بے رہ روی کے عام مظاہر میں شمار نہیں کیا جاتا، نئی نسل نے ترقی پسند تحریک کے زیر اثر معاشی سطح کی اسی اخلاقی بے راہ روی کو بڑی شدت سے محسوس کیا اور اس کا انسانی اخلاقیات کے ضوابط کا سخت جائزہ لینے کی ضرورت پر زور دیا۔"

باقر مہدی فرماتے ہیں:

"جدیدیت اصطلاح اردو ادب میں مختلف معنی و مفہوم رکھتی ہے، جب حالی نے پیروی مغرب کی تجویز پیش کی تھی اس وقت انگریزی میں

جدیدیت کے وہ معنی نہیں تھے جو بعد میں ایلیٹ وغیرہ نے دیئے، حالی صنعتی تہذیب کو لبیک کہنا چاہتے تھے، گو کہ انھیں صنعتی انقلاب کے جان لیوا اور خوش آئند دونوں قسم کے اثرات کا علم نہیں تھا، ان کے زمانے میں پیروی مغرب کی تجویز ایک جدت تھی، پھر حلقہ ارباب ذوق اور ترقی پسند تحریک نے جدیدیت کے الگ الگ معنی و مفہوم پیش کئے، ایک نئے تجربے اور ذات کے ستون تعمیر کرنے کی کوشش کی تھی، دوسرے نئے سماجی حقیقت نگاری کو جدیدیت کی کائنات سمجھ کر سودیت مارکس کو اپنایا تھا، یہ بحث خاصی پرانی ہے، پھر ترقی پسند مصنفین کی تحریک پارہ پارہ ہوگئی اور جدیدیت ایک سیلاب کی طرح اردو ادب پر چھا گئی۔''

جدید شاعری کے بارے میں مختلف نقادوں کی مختلف رائے پائی جاتی ہے، ابھی تک کوئی واضح اصول نہیں ملتا، جو کہ جدید شاعری کو سمجھا سکے، پرکاش فکری کے خیال میں نئی شاعری ایک Relatia اصطلاح ہے، نئی اور پرانی شاعری کے درمیان زمانی بعد کے علاوہ کوئی حد فاضل نہیں، نئی شاعری ترقی پسند شاعری سے اس لئے مختلف ہے کہ یک کے پاس منشورہ تھا، دوسرے کے پاس ایسی کوئی چیز نہیں۔

کرمت علی کرامت لکھتے ہیں:

''یوں تو مختلف نقادوں نے نئی شاعری کو مختلف انداز سے سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کی ہے لیکن غالباً کسی نے بھی جدید شاعری کی ایسی جامع تعریف پیش کرنے میں کامیابی حاصل نہیں کی، جو جدید شاعری کے گوناگوں اور لامتناہی پہلوؤں کا احاطہ کر سکے''

نئی غزل کے بارے میں مقصود عمرانی نے ایک جگہ لکھا ہے:

''غزل کے متعلق بات چیت کرتے وقت میرے پیش نظر ہمیشہ غزل کا وہ فارم رہتا ہے، جو روایتی غزلیات سے ہٹ کر ہے۔

روایتی غزل پر بات چیت کرنا اپنا وقت ضائع کرنے کے سوا کچھ نہیں اس لئے کہ صدیوں سے روایتی غزل کے متعلق بات چیت ہوتی رہی ہے، ہزاروں مضامین اور کتابیں اس سلسلے میں لکھی جا چکی ہیں، اس لئے اگر گاہے گاہے باز خواں ایں قصہ پارینہ لا کے مصداق اگر کوئی روایتی غزل کے متعلق معلومات کی بھی ضرورت پڑے تو ان کتابوں سے فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے۔''

میری رائے میں ہندوستان میں ۱۹۳۶ء میں انجمن ترقی پسند مصنفین کی تحریک کی بنیاد پڑنے کے بعد نئی غزل کا غیر روایتی دور شروع ہوتا ہے، جو لوگ بھی ارتقا کے قوانین سے واقف ہیں وہ جانتے ہیں کہ روایت کو یکا یک ترک نہیں کیا جا سکتا، بلکہ ابتدا میں روایت شکن حیثیت رہی ہوتی، جس کسی باپ کی انگلی پکڑ کر چلنے والے بچے کی ہوتی ہے۔

ڈاکٹر محبوب راہی لکھتے ہیں:

''مختلف مضامین اور کتب میں بکھری ناقدین کی رایوں کی روشنی میں جدید شاعری کی جامع تعریف کچھ اس طرح وضع ہوتی ہے، جدید شاعری عصری حسیت کے ساتھ عصری مسائل کے واشگاف اظہار کا نام ہے، یہ جدید تقاضوں کی شاعری ہے، کیفیات احساسات اور تاثرات کی شاعری ہے اور اس سے بھی واضح ترین تعریف یہ ہے کہ یہ آج کے انسان کے اظہار ذات کی شاعری ہے، آج انسان جو گوناگوں پیچیدہ مسائل میں گھرا ہوا ہے، نئے مسائل کا طوفان بلا خیز اصول و نظریات کے وہ تمام قلعے مسمار کر چکا ہے۔

جس میں کل تک وہ اپنے کو محفوظ سمجھتا تھا، اقتدار کی شکست و رغبت نے اس کے ہر محفوظیت کے احساس کو اور شدید کر دیا ہے، رشتے ناطوں کی پاکیزگی ختم ہو چکی ہے، اخلاقیات کے مفاہیم یکسر بدل چکے ہیں۔ محبت، پیار، اخلاص، دوستی، وفا، سچائی، ایثار جیسے مقدس الفاظ اپنا تقدس اور معنویت کھو چکے ہیں، ان کی جگہ نفرت، خود غرضی، ریاکاری، بیوفائی، جھوٹ، طعنے اور ابن الوقتی

سے آج کا انسان جا بجا دوچار ہوا ہے، اسے قدم قدم پر ذہنی کرب شدید انتشار، حالات کی تشکیک زدگی ذات کی شکستگی، وجود کی گم شدگی کل کی بے یقینی راستوں کی سمتیت حادثوں کی گوناگوں اسباب کی غیر منصفانہ تقسیم سماجی قدروں کے نمائشی کھوکھلے پن، رسوم وروایات کی لایقینی بندشیں، نظریاتی جکڑ بندی معاشرے میں منافقت اور ظاہرداری کا غلبہ، انحراف پسندی، جنس نگاری اور بے سکونی جیسے پیچیدہ مسائل کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔''

ظاہر ہے ان تمام باتوں کے اثرات اور شاعری پر پڑے اور خاص طور پر جدید شاعری پر، جدید شاعری میں جو فکر کی تبدیلیاں ہوئی ہیں، وہ ملک کی تبدیلیوں اور ماحول کی دین تھی یہی وجہ ہے کہ اردو کے جدید شعراء کے یہاں ذہنی انتشار اور کرب، بے چینی زیادہ پائی جاتی ہے۔ متین سید نے اس بارے میں لکھا ہے:

''نئی نسل کا المیہ یہ ہے کہ وہ اس وقت زندگی کے کھیل میں شامل ہوئی، جب ہر ذات اپنے لہو کے مچلتے ہوئے سرخ شعلوں میں سلگ رہی ہے، صدیوں کی خوابیدہ نفرتیں جاگ اٹھی ہیں، آنکھوں کے روزن سے سوائے باد سموم اور ریگ صحرا کے کچھ اندر نہیں آتا، اندر کا مکان ویران ہے، تمام دریچے کھول دینے کے باوجود گھٹن اور حبس سے نجات نہیں ملتی، ہر شخص خود اپنے ہاتھ کی رگیں کاٹ کر اپنا خون بہانے میں لذت پاتا ہے۔

رشتے بے جوڑ ہیں اور اکثر رشتے کمزور، آج کا انسان کل کے سورج کی موہوم سی امید کے بغیر حال کی تاریکی میں بھٹک رہا ہے، وہ کل بھی ہنستا تھا، آج بھی ہنستا ہے اور آنے والے کل میں بھی اسے تنہائی کا زرد چہرہ نظر آتا ہے۔ وہ اپنے ذہن کے تہہ خانوں سے سر ابھارتے ہوئے ہزاروں سوالات کا جواب تلاش کرتا ہے، لیکن مایوس ہو جاتا ہے، سوالوں کی زنجیر میں قید اس انسان کا اعتقاد مثبت اقدام پر سے اٹھ چکا ہے، پرانی کتابوں میں لکھی ہوئی ساری

حقیقتیں اور معجزے اسے مردہ نسلوں کی تاریک قبروں پہ آویزاں دھندلے کتبوں کی طرح محسوس ہوتے ہیں، اس کے پیش نظر کوئی واضح نصب العین نہیں، سہارے عقائد کی کوئی دیوار نہیں، وہ تشکیک اور بے یقینی کا اس حد تک شکار ہے کہ وہ نہ صرف اس ماحول سے بلکہ خود اپنے آپ سے خوفزدہ ہے، نئے انسان اور نئے شاعر کا یہی مزاج ہے، اس ذہنی انتشار نے آزادی کے بعد ہندوستان کے ہر فرد کو متاثر کیا ہے''

قاضی سلیم اپنی کتاب ''نیا ادب'' کے مسائل میں لکھتے ہیں:

''برسوں گذر جانے کے بعد بھی جدیدیت کے بارے میں کئی الجھنیں باقی ہیں اور یہ الجھنیں رفتہ رفتہ خطرے کی صورت اختیار کرتی جارہی ہیں، ایک خطرہ تو ان دانا دشمنوں کا ہے، جو اپنی ذہانت پرائی ساکھ اور علم کے بل بوتے پر غلط تعبیریں پیش کرنے کی کوشش کررہے ہیں، دوسرا خطرہ ان نادان دوستوں کا ہے، جو محض فیشن کے طور پر یا پکی روشنائی میں چھپا ہوا اپنا نام دیکھنے کی خاطر اوٹ پٹانگ باتیں کرتے رہتے ہیں، ان لوگوں کے نزدیک ہر بے ڈھنگی تحریر کچھ جدیدیت کی سند پائے ہوئے اکثر وبیشتر بے ربط اور ٹوٹے چھوٹے چند مصرعے اور کبھی کبھی دوسری زبانوں کے الفاظ کا استعمال بھی جدیدیت کی پہچان اور نئے ذہن کی علامت ہے، ان اصحاب سے طویل مذاکرہ ناگزیر ہے، لیکن ثانی الذکر بھائیوں کے مرض کا علاج شاید ہی کسی حکیم کے پاس ہو۔''

ہمارے موضوع کا تعلق اس دور کے ایک اہم شاعر ندا فاضلی سے ہے، ندا فاضلی نے جس گھر میں آنکھ کھولی، وہ علم وادب کا گہوارہ تھا، ان کے والد بھائی خود صاحب دیوان شاعر تھے، گھر میں ادبی سرگرمیاں ادبی محفلیں ہر وقت جمی رہتی تھیں، مقامی شعراء کے علاوہ بیرونی شعراء کے آنے جانے کا سلسلہ جاری رہتا تھا، اس کی وجہ یہ تھی کہ ان کے والد نہ

صرف اچھے شاعر تھے بلکہ گوالیار کے میلے میں جو مشاعرے ہوتے تھے، ان مشاعروں کا اہتمام دعا صاحب کرتے تھے اور مشاعرے کے بعد بھی دو دو دن تک بیرونی شعراء رکتے تو وہ دعا صاحب کے گھر پر ہی ٹھہرتے تھے۔ جہاں ادبی نشستیں اور بحث ومباحثے کا سلسلہ جاری رہتا، ان محفلوں میں ندا فاضلی بھی برابر شریک رہتے تھے، بڑے بڑے شعراء ان کے گھر آتے جاتے تھے۔

اس سلسلے میں ندا فاضلی اپنی خودنوشت ''دیواروں کے بیچ'' میں اس طرح لکھتے ہیں:

''گھر کے ادبی ماحول اور والد کے ساتھ شعری نشستوں میں شرکت کرنے نے ندا فاضلی میں بھی ادبی ذوق پیدا کر دیا تھا اور چھوٹی عمر میں ہی وزن میں مصرعہ جوڑنے کی صلاحیت ظاہر کرنے لگے تھے، نصاب کی کتابوں سے زیادہ قافیوں کی تلاش میں وقت ضائع کرنے لگے تھے، یادداشت اتنی اچھی ہے کہ داغ، نوح، اور اپنے والد کے بہت سے شعر یاد کر لئے تھے، انہیں کو الٹ پھیر کے شعر بنا لیتا ہے، گھر سے اسکول تک ریاض صاحب کے ساتھ جاتا ہے اور ہر روز راستے میں انہیں نئے شعر سناتا ہے، وہ چلتے رہتے تھے اور داد بھی دیتے جاتے تھے اور ساتھ میں اصلاح بھی دیتے جاتے تھے۔ اشعار کچھ اس طرح ہوتے تھے۔

قدر الفت میں ستمگر نے نہ جانی میری
ہائے دل ہائے جگر ہائے جوانی میری

جفائیں تم کئے جاؤ وفائیں ہم کئے جائیں
تمہیں وہ کام آتا ہے ہمیں یہ کام آتا ہے

ندا فاضلی کی یہی ابتدائی شاعری تھی۔''

ندا فاضلی کی شاعری کی ابتدا یہیں سے ہوتی ہے، مطالعہ کرنے کا شوق ادبی ماحول نے بہت جلد ندا فاضلی میں وہ شعور پیدا کر دیا، جو آگے چل کر ندا کو جدید شعراء کی فہرست میں شامل کر دیا، جس کا نام جدید شاعری کی پہچان بن گیا، انگریزی ادب کے مطالعہ نے بہت جلد ندا فاضلی کی شاعری میں فکری گہرائی پیدا کر دی اور رفتہ رفتہ ترقی کی منزلیں طے کرتے رہے، ان کی شاعری کے بارے میں بھی بے شمار نقادوں نے لکھا ہے۔ لیکن نقاد سے لکھنے کی انھوں نے درخواست نہیں کی بلکہ وہ زیادہ تر لڑتے ہی رہے ہیں، انھوں نے اس بات کا بھی خیال نہیں کیا کہ ان کی بحث کرنے کی عادت سے انھیں نقصان بھی ہو سکتا ہے اور بے شک نقصان ہوا بھی، لیکن ان کی شاعری نے بڑوں بڑوں کو لکھنے پر مجبور کر دیا اور اب مسلسل لکھا جا رہا ہے، حال ہی میں سہ ماہی ''انتساب'' کا ندا فاضلی نمبر شائع ہوا، جس میں بے شمار لوگوں نے، نقادوں نے، شعراء نے ان کی شاعری پر اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ مخمور سعیدی لکھتے ہیں:

> ''ندا فاضلی کی شاعری ہو یا ان کی نثر دونوں ایک انفرادی شان لئے ہوئے ہیں زندگی کی طرف ان کا رویہ بہت واضح ہے اور اسی رویے کی تشکیل چونکہ ان کے نجی تجربات سے ہوئی ہے، اس لئے اس میں وضاحت کے ساتھ التفات بھی ہے، وہ غزل اور نظم کو ابتدا ہی سے اپنا وسیلۂ اظہار بنائے ہوئے ہیں۔''

ندا فاضلی کے اب تک تین شعری مجموعے چھپ چکے ہیں۔ ''لفظوں کا پل'' ''مور ناچ'' اور ''آنکھ اور خواب کے درمیان'' ''مور ناچ'' دیوناگری میں بھی شائع ہو چکا ہے۔ اس کے علاوہ ''ملاقاتیں'' اور ابھی حال ہی میں ایک اور نثری کتاب ''دیواروں کے بیچ'' بھی چھپ چکی ہے۔ یہاں ان کے پہلے مجموعہ ''لفظوں کا پل'' سے کچھ اشعار پیش خدمت ہیں۔

نیل گگن میں تیر رہا ہے اجلا اجلا پورا چاند
کن آنکھوں سے دیکھا جائے چنچل چہرے جیسا چاند

من کی بھول باتوں سے چھینکیں تاروں کی ٹنیاں
پپیوں کی خاموشی شرارت سا چھپ چھپ کر ابھرا چاند

مجھ سے پوچھو کیسے کاٹی میں نے پربت جیسی رات
تم نے گودی میں لے کے گھٹنوں چوما ہوگا چاند

پردیس سونی آنکھوں میں شعلے سے لہراتے ہیں
بھابی کی چھیڑوں سے بادل آپا کی چٹکی سا چاند

تم بھی لکھنا تم نے اس بار کتنی بار پیا پانی
تم نے بھی تو چھت کے اوپر دیکھا ہوگا چاند

کبھی مجھے تھا یاروں سے اختلاف بہت
ہر اک بات پہ اب سر جھکا رہا ہوں میں

کہیں ملے کوئی اپنا تو پھوٹ کر رو لوں
کئی دنوں سے بہت مسکرا رہا ہوں میں

یہ بات پہلے لکھی جا چکی ہے کہ ندا فاضلی کی پوری شاعری پر ہندی شاعری کا اثر زیادہ ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ ندا فاضلی نے ہندی ادب کا گہرا مطالعہ کیا ہے۔ احتشام اختر لکھتے ہیں:

''ندا فاضلی کے کلام میں رومانیت کی چاشنی ہوتی ہے، اور پورا مزاج لڑکپن سے عاشقانہ ہے، کشش کی وجہ یہ ہے کہ ندا فاضلی کی شاعری پر ہندی

اسلوبیات کا گہرا اثر ہے، ہندی کے کلاسیکی شعراء کے علاوہ ندا ذاتی طور پر سوم ٹھاکر اور اوم پربھاکر کا گہرا اثر قبول کیا ہے، ندا فاضلی کا اسلوب سادہ اور آسان ہے۔ اور ان کی شاعری کے استعارات اور تشبیہات ہندی شاعری کی تشبیہات اور استعارات سے بہت قریب ہیں یہ ہی وجہ ہے کہ ندا کا کلام اور رسائل کی جرائد کے ساتھ ہندی کے رسالوں میں بھی پابندی سے شائع ہوتا رہا ہے۔''

ندا فاضلی نے غزل کو بہت کچھ دیا ہے ۱۹۶۰ء کے بعد جس جدید شاعری کے بارے میں بہت کچھ لکھا گیا اور لکھا جا رہا ہے، اس میں ندا فاضلی کے بغیر ان کے حوالے کے وہ مکمل مضمون ہو ہی نہیں سکتا، ندا فاضلی جب غزل کہتے ہیں تو ایسا لگتا ہے کہ وہ غزل کو ایک نیا روپ دے رہے ہیں حالانکہ ان کو نظم کا شاعر زیادہ کہا جاتا ہے، مگر ان کی غزلیں پڑھ کر انہیں غزل کا بڑا شاعر تسلیم کرنا پڑتا ہے، اس بات کا فیصلہ تو آئندہ نقاد ہی کریں گے یہاں ان کی غزلوں کے ایسے شعر پیش کر رہا ہوں، جو اردو غزل میں بلاشبہ ایک نیا اضافہ ہیں، خیال کے اعتبار سے بھی اور مفہوم کے اعتبار سے بھی۔ یہ اردو شاعری میں اپنی نوعیت کے منفرد اشعار ہیں۔

گھر سے مسجد ہے بہت دور چلو یوں کر لیں
کسی روتے ہوئے بچے کو ہنسایا جائے

بات کم کیجئے ذہانت کو چھپاتے رہیے
اجنبی شہر ہے دوست بناتے رہیے

دشمنی لاکھ سہی ختم نہ کیجئے رشتہ
دل ملے یا نہ ملے ہاتھ ملاتے رہیے

محبت میں وفاداری سے بچئے
جہاں تک ہو اداکاری سے بچئے

شرافت، آدمیت، دردمندی
بڑے شہروں میں بیماری سے بچئے

بنا پیروں کے سر چلتے نہیں ہیں
بزرگوں کی سمجھ داری سے بچئے

کہیں ملے کوئی اپنا تو پھوٹ کر رولوں
کئی دنوں سے بہت مسکرا رہا ہوں میں

کوئی ہنگامہ اٹھایا جائے
بے سبب شور مچایا جائے

ندا فاضلی کے یہ وہ شعر ہیں، جو بے شمار مضامین میں کوٹ کیے گئے ہیں، ہر نقاد نے ان کے حوالے دیے ہیں، جنھیں جدید شاعری کی بہترین مثال کہا گیا ہے، ندا فاضلی نے اپنی شاعری میں ان مصنوعی اور جھوٹی باتوں پر دھیان نہیں دیا بلکہ زندگی کے مختلف تجربات کو اپنی غزلوں میں پیش کیا ہے، چند اشعار دیکھئے، جو ان کی زندگی کے اسی تجربے اسی حادثے کا بیان ہیں، اب گھر کے بارے میں جسے وہ مختلف روپ میں اپنی نظموں میں نثر میں، شعروں میں ان کا پیچھا کرتا رہتا ہے، گھر ان کی شاعری میں کئی کئی علامتوں کے ذریعہ مختلف ڈھنگ سے کئی جگہ آیا ہے، چاہے وہ غزلیں ہوں یا نظمیں ہوں، یہ گھر دراصل ان کی زندگی کا بہت بڑا حادثہ ہے جسے وہ کئی بار گنوا چکے ہیں۔ جو کئی بار اجڑ چکا ہے، وہ گھر کے

سجانے میں ہمیشہ سوچتے رہے ہیں، لیکن نہ وہ گھر بسا سکے، نہ وہ گھر سجا سکے، حالانکہ بنا تو لیا ہے مگر بقول ان کے ''گھر صرف چھت کا نام نہیں ہے'' دیکھئے گھر کس کس روپ میں ان کے شعروں میں آیا ہے۔

شہر تو بعد میں ویران ہوا
مرا گھر خاک ہوا تھا پہلے

گھر سے چلے تھے پوچھنے موسم کا حال چال
جھونکے ہوا کے بالوں میں چاندی پرو گئے

اس کو رخصت تو کیا تھا مجھے معلوم نہ تھا
سارا گھر لے گیا گھر کو چھوڑ کر جانے والا

تم جو سوچو وہ تم جانو ہم تو اپنی کہتے ہیں
دیر نہ کرنا گھر جانے میں ورنہ گھر کھو جائیں گے

گھر سے مسجد ہے بہت دور چلو یوں کر لیں
کسی روتے ہوئے بچے کو ہنسایا جائے

اے شام کے فرشتو ذرا دیکھ کے چلو
بچوں نے ساحلوں پہ گھروندے بنائے ہیں

کس سے پوچھوں کہ کہاں گم ہو گئی برسوں سے
ہر جگہ ڈھونڈتا پھرتا ہے مجھے گھر میرا

ہم ہیں کچھ اپنے لئے کچھ زمانے کے لئے
گھر سے باہر کی فضا ہنسنے ہنسانے کے لئے

گھر کی دہلیز سے گیہوں کے کھیت تک
چلتا پھرتا کوئی کاروبار آدمی

اپنا غم لے کے کہیں اور نہ جایا جائے
گھر میں بکھری ہوئی چیزوں کو سجایا جائے

چاند میں کیسے ہوئے قید کسی گھر کی خوشی
یہ کہانی کسی مسجد کی اذاں سے سنئے

ندا فاضلی کے یہاں گھر کئی طرح سے نئی نئی علامتوں کے ذریعہ آیا ہے انور خان لکھتے ہیں:

''ندا فاضلی کی شاعری میں خاندانی رشتے ہندوستانی مزاج کی پوری رنگینی اور عصری انتشار کے ساتھ آتے ہیں، گھر اور رشتوں کے تصور کو آج کے کسی شاعر نے شاید اس قدر شدت سے محسوس کیا ہو، جس قدر ندا نے۔''

یہاں ندا فاضلی کی غزلوں سے کچھ اشعار پیش ہیں۔

ہر چمکتی قربت میں ایک نیا فاصلہ دیکھوں
کون آنے والا ہے کس کا راستہ دیکھوں

شام کا دھندلکا ہے یا اداس ممتا ہے
بھولی بسری یادوں سے پھوٹتی دعا دیکھوں

مسجد میں مسجدوں کی مشعلیں ہوئیں روشن
ہے چراغ گلیوں میں کھیلتا خدا دیکھوں

لہر لہر پانی میں ڈوبتا سورج
کون مجھ میں در آیا اٹھ کے آئینہ دیکھوں

لہلہاتے موسم میں تیرا ذکر شادابی
شاخ شاخ پہ تیرے نام کو ہرا دیکھوں

ایک اور غزل کے اشعار دیکھئے۔ یہ غزل ندا فاضلی کی بے حد مشہور ہوئی اور فلم میں شامل ہے۔

سفر میں دھوپ تو ہوگی جو چل سکو تو چلو
سبھی ہیں بھیڑ میں تم بھی نکل سکو تو چلو

کسی کے واسطے راہیں کہاں بدلتی ہیں
تم اپنے آپ کو خود ہی بدل سکو تو چلو

یہاں کسی کو کوئی راستہ نہیں دیتا
مجھے گرا کے اگر تم سنبھل سکو تو چلو

کہیں کوئی سورج دھواں دھواں ہے فضا
خود اپنے آپ سے باہر نکل سکو تو چلو

یہی ہے زندگی کچھ خواب کچھ امیدیں
انہیں کھلونوں سے تم بھی بہل سکو تو چلو

۱

ہر گھڑی خود سے الجھنا ہے مقدر میرا
میں ہی کشتی ہوں مجھی میں ہے سمندر میرا

ایک سے ہوگئے موسم ہوں کہ چہرے سارے
میری آنکھوں سے کہیں کھو گیا ہے منظر میرا

آئینہ دیکھ کے نکلا تھا میں گھر سے باہر
آج تک ہاتھوں میں محفوظ ہے پتھر میرا

ندا فاضلی کی شاعری میں زندگی کے تجربات اور مشاہدات فنکارانہ طریقے سے ان کے شعروں میں ملتے ہیں۔ ندا فاضلی کے تین شعری مجموعے بیحد مقبول ہوئے، پہلا ''لفظوں کا پل'' دوسرا ''مور ناچ'' اور تیسرا ''آنکھ اور خواب کے درمیان'' ''لفظوں کا پل'' سے لے کر آنکھ اور خواب کے رمیان تک ندا فاضلی نے جو سفر طے کیا ہے، وہ ان کی غزلوں نظموں، گیتوں، دوہوں میں دیکھا جا سکتا ہے۔

ڈاکٹر عنوان چشتی لکھتے ہیں:

''ندا فاضلی ایک صاحب طرز شاعر اور ادیب ہیں، شاعری میں اپنے گردو پیش کی چھوٹی چھوٹی چیزوں کو چن کر اپنی شعری کہکشاں سجائی ہیں، اور اپنی شاعری کے موضوعات کا انتخاب کیا ہے، نیز ان پر نئے انداز سے نظر ڈالی ہے اور ان کے باطن میں جھانک کر معنویت کی نئی دنیا تک رسائی کی کوشش کی ہے ،انھوں نے رسمی و روایتی شعری زبان کو خیر باد کہہ کر بول چال کی زبان اور کچے

رسیلے انداز بیان کو وسیلہ اظہار بنا دیا ہے، انکی شاعری میں محبت کی چمکار اپنی پوری مقصدیت اور بے باکی کے ساتھ موجود ہے۔''

آنکھ اور خواب کے درمیان سے کچھ غزلوں کے اشعار دیکھئے۔

ہم ہیں کچھ اپنے لئے کچھ زمانے کے لئے
گھر سے باہر کی فضا ہنسنے ہنسانے کے لئے

یوں لٹاتے نہ پھرو موتیوں والے موسم
یہ نگینے تو ہیں راتوں کو سجانے کے لئے

اب جہاں بھی ہو وہیں تک لکھو روداد سفر
ہم تو نکلے تھے کہیں اور ہی جانے کے لئے

میز پر تاش کے پتوں سے سجی ہے دنیا
کوئی کھونے کے لئے ہے کوئی پانے کے لئے

تم سے چھٹ کر بھی تمہیں بھولنا آسان نہ تھا
تم کو ہی یاد کیا تم کو بھلانے کے لئے

ایک اور غزل کے اشعار دیکھئے، جس میں ندا نئے تجربات سے دوچار ہیں:

اب خوشی ہے نہ کوئی درد رلانے والا
ہم نے اپنایا ہر رنگ زمانے والا

ایک بے چہرہ سی امید ہے چہرہ چہرہ
جس طرف دیکھئے آنے کو ہے آنے والا

اس کو رخصت تو کیا تھا مجھے معلوم نہ تھا
سارا گھر لے گیا گھر چھوڑ کے جانے والا

دور کے چاند کو ڈھونڈو نہ کسی آنچل میں
یہ اجالا نہیں آنگن میں سجانے والا

ایک مسافر کے سفر جیسی ہے سب کی دنیا
کوئی جلدی میں کوئی دیر میں جانے والا

سچ تو یہ ہے کہ ندا فاضلی نے اپنی شاعری میں اردو غزل کو نہ صرف نیا لہجہ دیا، بلکہ غزل کو فکر و معنی کے وہ گوہر عطا کیے ہیں کہ ندا فاضلی کو آج کا غالب کہا جائے تو بیجا نہ ہوگا۔

☆☆☆

ندا فاضلی کے دوہے

اس سے پہلے کہ ندا فاضلی کے دوہوں پر کچھ لکھا جائے بہتر ہوگا دوہے کی تاریخ پر ایک نظر ڈالی جائے اردو شاعری میں دوہے کی روایت بہت پرانی ہے، دراصل اردو میں تحقیق کا کام تسلی بخش نہیں ہو سکا ہے، یہی وجہ ہے کہ ہم بغیر تحقیق کے کوئی بھی حکم صادر فرما دیتے ہیں یا چند مضامین کو پڑھ کر انہیں مستند تسلیم کر لیا جاتا ہے، اس طرح دوہے کی بارے میں یہ کہا جاتا ہے کہ دوہا بھی گیت کی طرح ہندی ادب سے آیا، جب کہ اس میں کوئی سچائی نہیں ہے۔ اب چونکہ تحقیق کا کام بڑی تیزی سے جاری ہے اور نئے نئے گوشے سامنے آرہے ہیں، دوہے پر بھی کچھ کتابیں آئی ہیں، جن میں ایک کتاب ڈاکٹر سمیع اللہ اشرفی کی ''اردو شاعری میں دوہے کی روایت'' ابھی کچھ دن پہلے ہی شائع ہو چکی ہے، جس میں دوہے کی تعریف اور تاریخ پر مکمل بحث بھی ہے اور دوہے کے فن پر بھی کافی روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس سے پہلے کہ سمیع اللہ اشرفی کی کتاب ''اردو شاعری میں دوہے کی روایت'' سے کچھ اقتباسات پیش کئے ہیں خود ندا فاضلی اس بارے میں کیا کہتے ہیں وہ جان لیا جائے۔

ایک بار گوالیار کی ایک ہندی گوشٹھی میں ہندی کے مشہور گیت کار نیرج کو مدعو کیا گیا تھا، یہ پروگرام نیرج کے اعزاز میں تھا، جس میں ہندی اردو کے ادیبوں کے علاوہ شہر کا پڑھا لکھا طبقہ بھی تھا۔ کثیر تعداد میں چیمبر آف کانفرنس میں جمع ہو گیا تھا، جہاں اکثر کلچر پروگرام منعقد کئے جاتے تھے۔ یہ حسن اتفاق تھا کہ ان دنوں ندا فاضلی بھی بمبئی سے گوالیار آئے ہوئے تھے، انہیں بھی بہ اصرار ہندی والے لے گئے تھے۔

نیرج نے ہندی گیت پر تقریر کرتے ہوئے ہندی دوہے کے متعلق بات کہہ دی تھی کہ ہندی دوہا اردو غزل کے شعر پر بھاری ہوتا ہے اور ہندی دوہے کی صنف ہندی ادب کے لئے باعث فخر ہے، جس سے اردو والے خاطر خواہ واقف نہیں ہیں۔

نیرج کی تقریر کے بعد ندا فاضلی خود بخود مائک پر پہنچ گئے اور تفصیل سے دوہے اور غزل کے شعر کے فرق کو واضح کرتے ہوئے کہا دونوں صنفوں کی اہمیت پر علحدہ علحدہ وضاحت سے اظہار کیا، اور نیرج کو نام لیکر مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ:

''شاید آپ کو معلوم نہیں ہے کہ اردو میں دوہے کی روایت بہت پرانی ہے، جس کا سلسلہ حضرت امیر خسرو سے شروع ہوتا ہے۔ یہ بات الگ ہے کہ غزل کا دامن اتنا وسیع ہوتا ہے کہ بعد میں اردو والوں نے دوہے کی طرف توجہ کم دی، لیکن جدید اردو شاعری نے اس روایت کو پھر سے چلن دیا ہے، اور آج اردو کے بہت شعراء دوہے لکھ رہے ہیں، خود نیرج اس صنف کے عمدہ گوی نہیں ہیں، اس لئے دوہے کے متعلق انہیں بولنے کا حق نہیں پہنچتا۔''

دوہے کی روایت کے بارے میں ڈاکٹر سمیع اللہ اشرفی لکھتے ہیں:

''اردو زبان کے ابتدا کی نشوونما کے دور سے ہی اردو شاعری میں دوہے کی روایت کا سراغ ملتا ہے۔ تقریباً تیرہویں صدی عیسوی میں ہندوستان کے صوفیائے کرام نے اپنا پیغام راگ راگنیوں اور دوہوں کے ذریعہ سے عوام تک پہنچانے کی کوشش کی۔

اردو شاعری کے ابتدائی زمانے میں پنگل کے چھندوں بالخصوص چوپئی چوپائی اور دوہے کو کثرت سے کام میں لایا گیا اور یہ سلسلہ اس وقت تک جاری رہا، جب تک کہ ہندوستان میں بولی جانے والی عوامی زبان کو فارسی زبان نے پوری طرح متاثر نہیں کیا۔ فارسی کے زیر اثر قدیم اردو یا ہندوی زبان کی شاعری میں فارسی بحروں کے اوزان بھی استعمال ہونے لگے، لیکن اردو شاعری

میں فارسی بحروں کے اوزان بھی استعمال ہونے لگے لیکن اردو شاعری میں فارسی بحروں کے وہی اوزان زیادہ مقبول ہوئے۔ جو اوزان ان کے لسانی مزاج سے ہم آہنگ اور ہندوی کے صیغوں سے مطابقت رکھتے تھے، دوہے کی اہمیت اور اس کے مختلف روپ اردو شاعری کے ہر دور میں ملیں گے۔ جن کا مطالعہ اردو زبان کے لسانی ارتقاء کو سمجھنے میں بہت کچھ معاون ثابت ہو سکتا ہے۔''

سب سے پہلے ہندی، اردو میں دوہے حضرت امیر خسرو نے لکھے، میں اس سلسلے میں جولائی ۱۹۹۰ء کو ٹی وی کے پروگرام بزم میں دوہے پر ایک گفتگو تھی، جس میں عنوان چشتی، کمار پاشی، زبیر رضوی، کرشن موہن اور ہندی کے مشہور ادیب نامور سنگھ نے حصہ لیا تھا جس میں ان سے سوال کیا گیا تھا کہ ہندی میں سب سے پہلا دوہا کس نے لکھا تھا، اس کے جواب میں انھوں نے فرمایا تھا کہ سب سے پہلے دوہے امیر خسرو نے لکھے، اس کے بعد کبیر اور تلسی داس کے بہاری لعل نے دوہے فن کو عروج تک پہنچایا، ڈاکٹر سمیع اللہ اشرفی لکھتے ہیں:

''اردو شاعری کے آغاز اور ارتقاء کے ساتھ ہی اردو دوہے کی صنف وجود میں آ کر اپنی ارتقائی منزل طے کرنے لگے اور دوہوں کی ہیئت تو پراکرت اور اپ بھرنش کے اڑتالیس حرفی قدیم دوہے پر مبنی ہے۔ جو دو دو سطروں میں لکھا جاتا ہے اور دونوں سطریں ہم قافیہ ہوتی ہیں۔ ہر سطر میں چوبیس ماترائیں ہوتی ہیں اور اس کی ایک مخصوص چال ہوتی ہے، اردو شعراء نے جدت طرازی سے کام لے کر دوہے کی ہیئت کو برقرار رکھتے ہوئے اردو دوہوں میں مختلف اوزان کو ان کے مخصوص آہنگ کے ساتھ بھی استعمال کیا، مگر اردو یا ہندی کے ماہرین عروض نے ابھی تک ان کی طرف خاص توجہ نہیں دی ہے۔''

ہمیں زیادہ بحث دوہے کے فن پر نہیں کرنا ہے، صرف دوہے کے ارتقاء پر ایک نظر ڈالنا ہے۔ ش۔ک۔ نظام لکھتے ہیں:

''دوہوں کی چھان بین کے لئے ایک چیز اور ہے لغت، فرہنگ آصفیہ میں لکھا ہے دوہا دوہرا لذکر جوز ا ہیئت دو مصرعوں کا ہندی شعریت کی اپنی حدود میں ایسے ہیں، ہندی سے رجوع کرنے کے علاوہ کیا چارہ ہے؟ یہاں یہ سوال پیدا ہوسکتا ہے کہ جب ہم یہ مان رہے ہیں کہ دوہا تو اردو کی اصناف سخن میں سے ہے، پھر ہندی کی طرف رجوع کیوں کریں، سوال تو واجب ہے مگر ایک مدت مدید سے ہم نے دوہے سے رشتہ منقطع کرلیا ہے، یہ بھی حقیقت ہے اور اسے ہندی قرار دے دیا ہے، دوہا اب جو صرف ہندی کی وراثت ہے ہے، کسی زمانے میں اردو ہندی کی مشترکہ امانت تھی، اس وقت اردو ہندی کا قضیہ ہی کیا تھا، بڑی حقیر رویے میں دوہا آج بھی مشترکہ وراثت ہے، اکیلی ہندی اس کی مالکن نہیں ہوسکتی۔''

ہمیں اس بات سے زیادہ بحث نہیں کرنا ہے، کہ جدید شعراء میں سب سے پہلے دوہے کس نے لکھے اور اس روایت کو آگے بڑھانے میں کن شعراء نے حصہ لیا، کیونکہ ہمارے موضوع کا تعلق جدید شاعر سے ہے جس نے اردو میں منفرد دوہے لکھے۔ ڈاکٹر شاہد میر نے ایک گفتگو میں بتایا کہ اردو کے جدید شعراء میں سب سے پہلے سرشار نے دوہے لکھے اب تو اردو کی جدید شعر گوئی میں ایک بھیڑ چلی ہے، جو دوہے لکھ رہی ہے، اردو میں جس شاعر نے دوہے کی روایت کو استحکام بخشا، ان میں جمیل الدین عالی کا نام سرفہرست ہے، جمیل الدین سے سب سے زیادہ دوہے لکھے اور پھر تو بہت سے شعراء نے اس روایت کو آگے بڑھایا۔ ان میں بیکل اتساہی، سرشار بلند شہری، کرشن موہن، بھگوان داس اعجاز، ڈاکٹر شاہد میر، ظفر گورکھپوری، ش۔ک۔ نظام، ندا فاضلی، کرشن مراری، جمال پانی پتی، اور دوسرے کئی شعراء۔ ڈاکٹر سمیع اللہ اشرفی اپنی کتاب ''اردو شاعری میں دوہے کی روایت'' میں تفصیل سے دوہا نگاروں کے تمام فن پر بحث کی ہے اردو دوہے کی روایت کے ارتقاء پر ایک اور جائزہ لیا ہے۔

لیکن اس کتاب میں بھی بہت سے ایسے شعراء کا ذکر نہیں کیا گیا، جو آج اردو میں بہت اچھے دوہے لکھ رہے ہیں، مثلاً ظفر گورکھپوری، ڈاکٹر شاہد میر، ش۔ک۔ نظام، وغیرہ اور کچھ شعراء کے صرف نام گنوائے ہیں، جن کے وہ دوہے اپنی کتاب میں شامل نہیں کر سکے، وہ اپنی کتاب اردو شاعری میں دوہے کی روایت میں لکھتے ہیں:

''دور حاضر کے بہت سے ایسے شاعر ہیں جنہوں نے اردو دوہوں پر طبع آزمائی ہے لیکن اس کتاب میں ان کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ اس میں میری نارسائی کو بہت بڑا دخل ہے کہ مجھے ان کے دوہے حاصل نہیں ہو سکے۔ عبدالعزیز خالد، سرشار بلند شہری، نگار صہبائی، صہبا اختر، چندر بھان خیال، رشید شیرانی، حامد برگی، شاعر صدیقی، رحمہ شریف، انوار انجم، افضل پرویز، بھگوان داس اعجاز، محمود علی، ٹھاکر مان عرش سرحدی، اے ڈی راہی، جمیل عظیم آبادی، عابد پشاوری، صائمہ خیری، اور کچھ اور بھی اردو کے ایسے معروف اور قابل ذکر شعراء ہیں جنہوں نے دور حاضر میں اردو دوہے کی صنف کو توانائی بخشی، میری کوشش ہوئی کہ اس کتاب کی آئندہ اشاعت میں دور حاضر کے سب ہی دوہا نگاروں، شاعروں کے دوہوں کے تجربات، نمونے، تبصرے کے ساتھ شامل کر لئے جائیں گے۔ تاکہ بیسویں صدی عیسوی تک اردو دوہوں کا تاریخی جائزہ مکمل ہو سکے۔ ندا فاضلی ۱۹۶۰ء کے بعد آنے والی نسل کے معروف شعراء میں شمار کیے جاتے ہیں۔ اور ۱۹۷۹ء سے ۱۹۸۶ء تک ان کے تین شعری مجموعے ''لفظوں کا پل'' ''مورناچ'' اور ''آنکھ اور خواب کے درمیان'' کے عنوانات سے منظر عام پر آچکے ہیں۔ ندا فاضلی بنیادی طور پر غزل، نظم، گیت کے شاعر کی حیثیت سے اپنی الگ شناخت رکھتے ہیں، لیکن دوہا نگاری کے فن میں بھی انھیں مکمل عبور حاصل ہے، فنی اعتبار سے ان کے دوہے مروجہ اڑتالیس حرفی دوہے کی جملہ شرائط کو پورا کرتے ہیں، جو لوگ اکثر اردو دوہوں کے فن پر تنقید کرتے ہیں، یا کرتے

رہتے ہیں ان کو بھی ندا فاضلی کے دوہوں میں فنی پختگی کو تسلیم کرنا پڑے گا۔ بندش نہایت چست ہے، جس کے باعث ان کے دوہوں کی چال میں ایک سبک دوہا کی سی روانی کا احساس ہوتا ہے۔ ان کے دوہوں کا موضوع روز مرہ کی زندگی کے عام مسائل ہیں، جن دوہوں کی علامات اور جدید تشبیہات واستعارات کے ساتھ سادہ مگر ایسے پراثر انداز میں پیش کرنے پر قادر ہیں۔ جس سے کوئی بھی سامع یا قاری متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔''

لے کے تن کے ناپ کو گھر سے بستی گاؤں
ہر چادر کے گھیرے سے باہر نکلے پاؤں

سب کی پوجا ایک سی الگ الگ ہر ریت
مسجد جائے مولوی کوئل گائے گیت

دیکھئے دوہے ندا فاضلی فرماتے ہیں ۔

میں رویا پردیس میں بھیگا ماں کا پیار
دکھ نے دکھ سے بات کی بن چٹھی بن تار

اچھی سنگت میں بیٹھ کر سنگی بدلے روپ
جیسے مل کر آم سے میٹھی ہوگئی دھوپ

وہ صوفی کا قول ہو یا پنڈت کا گیان
جتنی بیتے آپ پر اتنا ہی سچ مان

اوپر سے گڑیا لگے اندر کاٹھ کباڑ
گڑیا سے ہے پیار تو ٹانکے نہیں اکھاڑ

یگ یگ سے ہر باغ کا یہ ہی اک اصول
جس کو ہنسنا آ گیا وہ مائی پھول

پنچھی چڑیا دھوپ کی دور گگن سے آئیں
ہر آنگن مہمان سی پکڑو تو اڑ جائیں

سپنا جھوٹا نیند کا جاگیں آنکھیں پیاس
پانا کھونا کون سا سانسوں کا اتہاس

ساتوں دن بھگوان کے کیا منگل کیا پیر
جس دن سوئے دیر تک بھوکا رہے فقیر

ہندوستان میں آج بہت دوہے لکھے جا رہے ہیں، بھگوان داس اعجاز، ظفر گورکھپوری، محمود اسدی، شاہد میر، سرشار بلند شہری، ش۔ک۔ نظام، ناوک حمزہ پوری، اور دیگر لیکن ابھی تک ندا فاضلی کے چند دوہوں سے ان کا موازنہ کیا جائے تو یہ بات ہر شخص کہہ سکتا ہے کہ ندا فاضلی جیسے دوہے ابھی تک کسی نے نہیں کہے۔

وہ فن کے اعلیٰ نمونے کہے جا سکتے ہیں، ندا فاضلی نے دوہوں میں جو وسعت اور فکر پائی جاتی ہے، وہ مشکل سے ہی نظر آئے گی، ندا فاضلی نے اپنی انفرادیت کو قائم یہاں بھی رکھا ہے، حالانکہ ان کے دوہوں پر ابھی اتنا نہیں لکھا گیا، ندا فاضلی کے دوہوں میں ہندوستان کی تہذیب، یہیں کی مٹی کی بو باس، اپنی دھرتی سے پیار کا رشتہ، ماں کا پیار، جیسی عظیم رشتوں کی جھلک صاف دکھائی دیتی ہے، سلیم انصاری نے لکھا ہے:

''ندا فاضلی کے یہاں دوہوں میں نئی لفظیات اور علامات واستعارات کے کامیاب تجربے ہیں بلکہ یوں کہا جائے کہ بعض اوقات ندا فاضلی

دوہوں کو اس طرح تخلیق کرتے ہیں کہ ہر دوہا غزل کا منفرد مطلع محسوس ہونے لگتا ہے، انہوں نے اپنی جدید منفرد غزل کے بیشتر موضوعات کو دوہے کے وسیلے سے پایہ اظہار تک پہنچانے کا خوبصورت فریضہ انجام دیا ہے۔''

چند دوہے دیکھئے۔

نینوں میں تھا راستہ ہردے میں تھا گاؤں
ہوتی نہ پوری یاترا گھس گئے دونوں پاؤں

دکھ کی نگری کونسی آنسو کی کیا ذات
سارے تارے دور کے سب کے چھوٹے ہاتھ

تتلی بیٹھی پھول پر شاعر کرے وچار
دو ملکوں کے بیچ میں سرحد کی دیوار

اچھی سنگت بیٹھ کر سنگی بدلے روپ
جیسے مل کر آم سے میٹھی ہوگی دھوپ

ندا فاضلی نے اپنے دوہوں میں معنی فکر کا ایک سمندر سمو دیا ہے، جتنا سوچیں گے اتنا ہی معنی فکر کا گہرا خزانہ ملے گا۔

ندا فاضلی نے جس طرح غزل اور نظم میں اپنا ایک الگ مقام بنایا ہے، اسی طرح ان کے دوہے پڑھ کر اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ وہ دوہا نگاری میں بھی کسی سے پیچھے نہیں ہیں۔ بلا شبہ یہ دوہے اردو ادب کا مکمل نمونہ ہیں۔

☆☆☆

ندا فاضلی کے فلمی گیت

ڈاکٹر عظیم الحق اپنی کتاب ''اردو ادب کی تاریخ میں فلموں کے گیت'' میں فلموں کے گیتوں سے متعلق لکھتے ہیں:

''فلموں کے گیت اردو میں کوئی نئی چیز نہیں، اس لئے کہ انیسویں صدی کے آخری ڈراموں کے ذریعہ اردو میں آ گئے تھے۔ اب فلم کی مقبولیت کے ساتھ گیتوں کا رواج بھی بڑھتا جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ گیت سطحی جذبات کی عکاسی کرتے ہیں، کافی تعداد ایسے گیتوں کی بھی مل جائے گی، جن میں زندگی کی اعلیٰ قدریں اور لطیف جذبات کی نرمی پائی جاتی ہے۔''

فلمی گیت لکھنے والوں میں ساحر، مجروح، شکیل بدایونی، پردیپ، جاں نثار اختر وغیرہ مشہور گیت کار ہیں، فلموں کی وجہ سے گیت کی ہر دلعزیزی موجودہ دور میں بھی روز افزوں ہے، حالانکہ گیت کی ہیئت کا تعین ابھی نہیں کیا جا سکا اور شاید کیا جا سکتا بھی نہیں۔ مگر معین حالت میں بھی اس کا دائرہ اور مقبولیت بڑھتی جا رہی ہے، کیونکہ ندا فاضلی بھی ایک اہم فلمی گیت کاروں میں شمار کئے جاتے ہیں۔ اور بے شمار فلموں میں انھوں نے بہت خوبصورت گیت لکھے ہیں، جو آج بچے بچے کی زبان پر ہیں، ندا فاضلی تقریباً بیس سال سے فلمی گیت لکھ رہے ہیں۔

ندا فاضلی فلمی دنیا سے کس طرح منسلک ہوئے اس کے بارے میں وہ لکھتے ہیں:

''شاد عظیم آبادی کا مصرعہ ''میں خود آیا نہیں لایا گیا ہوں'' میرے

ساتھ بھی یہی کچھ ہوا۔فلمی دنیا نہ میری منزل تھی ،نہ ہے،روٹی روزی کے لئے آدمی کو کوئی کام کرنا پڑتا ہے،تو میں فلمی گیت لکھنے لگا۔اس سے پہلے فلمی جرنلزم کرتا تھا، ادبی مضامین لکھتا تھا،مشاعرے پڑھتا تھا اور اب گیتوں سے پیسے مل جاتے ہیں، فلمی دنیا سے میرا تعلق ایک اتفاقی حادثہ ہے،ایک دن راجندر سنگھ بیدی کے آفس میں گیا وہاں انہوں نے میرا تعارف ایک فلم ڈائریکٹر سے کرادیا وہ مجھ سے Impres ہوگئے اور مجھ سے فلموں میں لکھنے کے لئے اصرار کیا،بس لکھنا شروع کردیا اور اب تک کئی اچھی بری فلموں میں مکالمے اور گانے لکھ چکا ہوں۔''

ندا فاضلی نے درجنوں فلمی گیت لکھے ہیں،جس میں رضیہ سلطان، آہستہ آہستہ، آپ تو ایسے نہ تھے، ناخدا، بلو بادشاہ، لوہا، ملک، کنواری بہو، جائیداد، وجے، اور ایک نیا رشتہ وغیرہ۔فلمی گیت لکھنا ایک مشکل فن ہے، جسے ہر شاعر کے لئے لکھنا کم از کم ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے،یہی وجہ ہے کہ مجاز لکھنوی، آرزو، اور جوش ملیح آبادی جیسے شاعر اچھے فلمی گیت کار ثابت نہ ہوسکے۔

اس لئے کہ فلموں میں گیت لکھنے کے لئے ڈائریکٹر کے اشاروں اور موسیقاروں کے مشورے کبھی کبھی شاعر کے لئے مصیبت بن جاتے ہیں، فلمی گیت کی کہانی اور Situation کے اعتبار سے لکھے جاتے ہیں، جبکہ پہلے فلمی گیت فلم بننے سے پہلے لکھے جاتے تھے، لیکن Situation کے اعتبار سے لکھے جاتے ہیں، اس سلسلے میں جاں نثار اختر لکھتے ہیں:

''فلم کے گیت بنیادی طور پر ڈرامے کا حصہ ہوتے ہیں، یہ گیت فلمی کہانی کے پس منظر میں مختلف کرداروں کی نوعیت کے لحاظ سے لکھے جاتے ہیں، انہیں ڈرامے سے الگ کرکے دیکھنا نہیں ہوتا، یہ بات اہم ہے کہ گیت صحیح معنوں میں ڈرامے کا ہی حصہ ہیں، جب کہانی کو آگے بڑھانے یا کم سے کم اس لمحہ کو ایک جذباتی شدت دینے میں معاون ثابت ہوں، موقع بہ موقع کرداروں کا گیت

گاتے رہنا، ڈرامے میں مددگار ثابت ہونے کے بجائے الٹا ثابت ہوتا ہے، اس بات کو جو فلم ساز یا ہدایت کار پیش نظر نہیں رکھتے، وہ اپنی فلموں سے خود دشمنی کرتے ہیں۔''

ندا فاضلی ایک مشہور فلمی گیت کار کی حیثیت سے سامنے آئے ہیں، حالانکہ انہوں نے فلم کو روزی روٹی کے لحاظ سے ضرور اپنایا ہے۔ لیکن اپنے معیار کو نہ صرف برقرار رکھا ہے بلکہ اسے قائم رکھنے میں کبھی کبھی فلموں کو نظرانداز بھی کر دیا ہے اور ویسے بھی فلموں گیتوں کو ادبی معیار پر پرکھنا مناسب نہ ہوگا، اس سلسلے میں ندا فاضلی لکھتے ہیں:

''فلمی گیتوں کو ادبی معیار پر پرکھنا درست نہیں، ادبی تخلیق کے لئے غیر مشروط ذہن اور تجربے کے شخصی اظہار کی ضرورت ہوتی ہے اور فلمی دنیا میں سرے سے ہی یہ فضا نہیں ہے، جہاں گیت کار کو اپنے طور پر سوچنے سمجھنے کا موقع ملے، فلم سازی ایک اجتماعی عمل ہے، جس میں شریک ہر ذہن کی حدود متعین ہوتی ہیں، فلم کی کہانی کے انتخاب سے لے کر ڈائریکٹر کے Yisusls تک گیت کار کو کئی مراحل سے گذرنا پڑتا ہے، ان مراحل سے گذرنے کا جو میوزک، ڈائریکٹر کی ٹیون کی منزل آتی ہے، جس کو سر کیے بغیر کوئی گیت فلمی نغمے کا روپ نہیں لے پاتا، فلم میں کہانی کا انتخاب فلم ساز کی ذاتی پسند و ناپسند کا معاملہ ہے، اس انتخاب میں اس کے سامنے صرف فلم کا تجارتی پہلو ہوتا ہے، میکانکی واقعات سے بنا ہوا فارمولا جسے فلم کہا جا سکتا ہے، اپنے ارادوں میں گنجائشیں بھی رکھنا، جہاں ذہن اپنے متعین عمل کے دائرے میں بھی تھوڑا بہت سوچ سکے، کہانی کے چناؤ میں گیت کار کا کوئی رول نہیں ہوتا۔ کہانی کو سنیما اسکرپٹ تبدیل کرتے وقت بھی جب رائٹر ڈائریکٹر اور متعلقین کے تجارتی مشوروں کی روشنی میں گیتوں کے لئے تعلقات Setaatinge فلم موسیقار کے توسط سے شاعر یا گیت کار کو میوزک ڈائریکٹر کی سفارش پر ہی فلم میں شامل کیا جاتا ہے، ہر موسیقار کے ساتھ ایک دو

گیت کار بڑے رہتے ہیں اپنے گروپ سے باہر کسی گیت کار کے ساتھ وہ کام کرنا پسند نہیں کرتا، فلم میں الگ سے گیت کار کی کوئی حیثیت نہیں ہوتی۔''

فلمی گیت کاروں میں یوں تو آرزو لکھنوی، مجاز لکھنوی، جوش ملیح آبادی جیسے بڑے شاعروں کا بھی شمار ہوتا ہے، ان کے علاوہ اور بھی بڑے بڑے ادیب وشاعر فلمی دنیا سے منسلک رہے، جیسے شکیل بدایونی، کیفی اعظمی، قتیل شفائی، مجروح سلطانپوری، ساحر لدھیانوی اور ادیبوں میں کرشن چندر، سعادت حسن منٹو، خواجہ احمد عباس، راجندر سنگھ بیدی، عصمت چغتائی، شاہد لطیف، اور راما نند ساگر جیسے ادیب بھی منسلک رہے ہیں، جنھوں نے اپنی بہترین کہانیوں کے ذریعے اور اپنے فن کے ذریعہ بہترین نمونے پیش کئے ہیں، اور ار دو زبان کو مقبول بنانے میں فلمی ادیبوں اور شاعروں کا ایک اہم رول رہا ہے، اس لئے کہ فلم بھی ایک ایسا ذریعہ ہے، جو عوام تک پہنچنے کا واحد وسیلہ ہے۔

اس سلسلے میں ''شاعر'' رسالے کے ایڈیٹر مرحوم اعجاز صدیقی نے لکھا ہے:

''موجودہ دور میں اردو کے دو ہی پلیٹ فارم ہیں، ایک مشاعرہ اور دوسرا فلم، دس دس پندرہ پندرہ ہزار لوگ مشاعروں میں شریک ہوتے ہیں اور کبھی اس سے بھی زیادہ رنگ اور نسل کے امتیاز کے بغیر اردو شاعری کو پوری توجہ سے سنتے ہیں، خوش ہوتے ہیں اور متاثر بھی، ایسی ہی دلچسپی فلمی گانوں سے لی جاتی ہے، جو عام طور پر اردو زبان میں ہوتے ہیں، عوام کو جب اس حد تک متاثر کیا جا سکتا ہے، تو کیا یہ اردو شعرا نہیں کر سکتے کہ وہ اپنی زبان کو سب کی زبان بنا دیں ، بھارت کی زبان۔ اور اس میں شک نہیں کہ اردو مشاعروں اور فلموں کے ذریعہ اردو زبان دنیا کے کونے کونے میں پھیل گئی ہے اور دن بدن اس کی مقبولیت میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے، آج کے دور میں فلم ہی ایک میڈیا ہے، جو عوام تک ان کے دلوں کے ذریعہ سے فلم کے پلیٹ فارم سے آج اردو گھر گھر پہنچ گئی اور اس میں فلمی گیت کاروں کا بہت اہم رول رہا ہے۔''

اردو شاعری کی مقبولیت میں سب سے زیادہ اضافہ اگر ہوا ہے تو وہ صرف فلمی گیتوں کی وجہ سے ہوا ہے، حالانکہ فلمی گیت کاروں کو فلم کی کہانی کے اعتبار سے گیت لکھنا پڑتے ہیں، پہلے ضرور گیت فلم بننے سے پہلے لکھ لئے جاتے تھے اور بعد میں انھیں فلم میں شامل کیا جاتا تھا، یعنی فلمی گیتوں کے لئے جہاں ضرورت ہوتی تھی، موقع محل سے شامل کرلیا جاتا تھا، لیکن اب ایسا نہیں ہوتا، اب پہلے گیت کے دھن اس کے اعتبار سے بعد میں گیت لکھے جاتے ہیں۔ ہاں ساحر لدھیانوی نے ہمیشہ پہلے گیت لکھے اور بعد میں انھیں فلمایا گیا، ساحر لدھیانوی نے کبھی ڈائریکٹر یا سنگیت کاروں سے سمجھوتہ نہیں کیا، لیکن کبھی کبھی انھیں بھی مجبور ہونا پڑا، اس بارے میں ندا فاضلی اپنے ایک مضمون ''فلموں میں گیت سازی'' میں لکھتے ہیں:

''ساحر کے گیت'' جیون کے سفر میں راہی'' میں لفظ کی پوری آواز سے کیونکہ راگھو کا Mote نہیں بنتا، اس لئے مجبوراً گائک کو راہی میں الف کی آواز کو کم کر کے رہی کر کے گانا پڑا، اور اسی طرح دوسرے مصرعے میں ملتے میں بچھڑ جانے کو کے پھیلاؤ کوٹ کر جانے کو کرنا پڑا، ساحر لفظوں کی تبدیلی میں تھوڑا بہت پس وپیش بھی کرتے ہیں، لیکن بیشتر گیت کار گیت کے لفظوں میں گرامر کو بالائے طاق رکھ کر ہر ممکن تھوڑ پھوڑ کے لئے رضا مند ہو جاتے ہیں، روی کی دھن میں شکیل بدایونی کے گیت، چودھویں کا چاند ہو یا آفتاب ہو، جو بھی ہو خدا کی قسم لاجواب ہو، بھی پہلے مصرعے کا ایک دکن ٹیون کی آف بیٹ کی نذر ہو گیا، شکیل کا اصل مصرعہ تم چودھویں کا چاند ہو یا آفتاب ہو، تھا مگر تم کے استعمال سے کیونکہ ٹیون کی آف بیٹ کا حسن نہیں ابھرتا تھا۔ اس لئے شکیل کو مجبوراً اس لفظ کو حذف کرنا پڑا، ٹیون بھرنے میں الفاظ کے ساتھ بے یقینی کھلواڑ کرنے کی ایک مضحکہ خیز مثال فلم ''سسرال'' میں حسرت جے پوری کا گیت ہے، اس گیت کا مکھڑا ہے
''جاناں تمہارے پیار میں شیطان بن گیا ہوں، کیا بننا چاہا تھا بے ایمان بن گیا

ہوں'' اس میں ''بنا چاہا'' اور ''بے ایمان'' کے ساتھ جو سلوک کیا گیا ہے، وہ تو خیر ہے ہی، مگر اس گیت کے دوسرے مصرعے انترے میں جس کا پہلا مصرع ''اب تو پتھر کی اک تصویر ہوں'' ہے، دوسری لائن ''ہوں'' ہے یا مجھ کو ایک پتر بے پیر ہوں، اسی دوسری لائن میں بہت بے پیر کی بے معنی ترکیب صرف ٹیون کو بھرنے کے لئے استعمال ہو رہی ہے، جس کے اپنے کوئی معنی نہیں ہیں۔ اس طرح کی بہت سی مثالیں فلمی گیتوں میں مل جائیں گی، فلمی گیت ہر شاعر کے بس کا نہیں ہوتا یہ تو ایک فن ہوتا ہے، جو تجربات سے حاصل ہوتا ہے یہی وجہ ہے کہ فلمی دنیا میں جوش، آرزو اور مجاز جیسے شاعر نہ جم سکے۔''

دراصل فلمی گیتوں کو ادبی صنف قرار دینا ممکن نہیں ہے، اس لئے کہ فلمی گیت صرف کہانی اور موقع محل کے اعتبار سے لکھے جاتے ہیں، ندا فاضلی لکھتے ہیں:

''فلموں میں گیت معیاری ادبی صنف کی حیثیت سے زندہ رہا ہے اور نہ ہی آئندہ اس کا کوئی امکان ہے، گیت اردو غزل کی طرح داخلی اظہار کا نمائندہ ہے، اس میں فرد کی اندرونی کشمکش کو لفظوں کے ہلکے گہرے رنگوں سے سمیٹنے کی کوشش کی جاتی ہے، گیت اور غزل میں ایک نیا بنیادی فرق بھی ہے، یہ ابتدائی تہذیبوں کی علامتیں ہیں، غزل کے سروں کا بکھراؤ اور اس کی رمزیاتی زبان قبائلی کشادگیوں کا نغمہ ہے، گیت اس کے برعکس ٹھہری ہوئی زراعتی تہذیب کے گھریلو پن کی زبان ہے۔

غزل اور گیت کے کردار بھی اسی لحاظ سے مختلف ہیں، گیت کا نسائی کردار لفظوں کے کومل اور لمبے سروں کے استعمال کا تقاضہ کرتا ہے، جب کہ غزل کا مزاج اور اس کا کردار ہمیشہ مردانہ رہا ہے، لیکن فلموں میں گیت اس معنی میں استعمال نہیں ہوتا، نظم، غزل، گیت، قطعہ یہاں ہر صنف کو گیت ہی کہا جاتا ہے، فلموں کے وہی گیت اچھے اور معیاری ہیں، جو فلمی گیتوں کی پابندیوں سے آزاد

ہو کر لکھے گئے ہیں، ان میں سے بیشتر گیت تو وہی ہیں، جو شاعروں کے مجموعوں میں شامل ہیں، اور جنہیں وہ فلم بننے سے پہلے تخلیق کر چکے تھے، یا مشاعرہ گاہوں میں پڑھ چکے تھے، کسی فلم ساز کو کوئی چیز پسند آ گئی اور اس نے اسے فلم میں استعمال کرنے کی اجازت لے لی، کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کوئی شاعر یا........ اپنی کسی تخلیق کو فلم میں دینے سے انکار کر دیتا ہے اور بعد میں پچھتاتا ہے کہ اس کی نظم کی ہو بہو نقل فلمی گیت کا روپ دھار کر سامنے آ چکی ہے، غرض یہ کہ فلمی گیت لکھنا بڑا جوکھم کا کام ہے۔"

اس فیلڈ میں کوئی شاعر کامیاب نہیں ہو سکتا، یہاں تو قدم قدم پر سمجھوتا کرنا پڑتا ہے، ندا فاضلی نے یوں تو تقریباً بیس فلموں میں گیت، مکالمے وغیرہ لکھ چکے ہیں، لیکن وہ فلمی دنیا سے سمجھوتا نہ کر سکے، یہی وجہ ہے کہ ان کے گیت فلمی کم ادبی زیادہ ہوتے ہیں۔

جس طرح اردو غزل فارسی سے ماخوذ ہے، نثری نظم، ہائیکو وغیرہ انگریزی اور دیگر زبانوں کے ادب سے اردو میں رائج کی گئیں، اور کی جا رہی ہیں۔ اسی طرح گیت ہندی ادب سے اردو شاعری میں اخذ کیا گیا ہے، یہ بات الگ ہے کہ اردو شاعروں نے اپنی محنت صلاحیت اور کاوشوں سے گیت کو اردو میں ایک منفرد لب و لہجے کے ساتھ مقبول کیا، نظیر اکبر آبادی سے لے کر ندا فاضلی تک خوبصورت گیت لکھے گئے، لیکن ندا نے ہندی گیت اردو میں ایک حربے کے طور پر اپنایا، اور گیت جو دیہاتی تہذیب کا متقاضی ہے، ندا گاؤں کی وہ مکمل فضا رنگ و روپ لب و لہجہ نرمی و شیرینی، شوخیوں کو گیت میں سمو کر گیت کو ایک نیا روپ دیا، اس کے ساتھ ساتھ ان کے گیتوں میں شیرینی موجودہ تہذیب اور عصری حسیت بھی پائی جاتی ہے، گیت کھیتوں سے پنگھٹ سے اور چوپالوں سے اٹھ کر ندا کے دل و ذہن میں رقص کرتا ہوا ان کی شاعری کا ایک علیحدہ سے ہی باب بن گیا ہے، ان کے چند گیتوں کے اقتباس یہاں نوٹ کیے جاتے ہیں۔

کئی دنوں سے چاند اگا

نہ سورج نکلا
جب سے تم پردیس گئے ہو
بہت اندھیرا ہے

رات رات بھر پانی برسے
دھول اڑے دن دن بھر
لوہارن لوہے کو پیٹے
لگے ہتھوڑا من پر
بڑھئی بچارا لکڑی چیرے
میں دیکھوں اٹھ اٹھ کر

نئی صراحی میں بھی پانی
ندیا جیسا ہے
جب سے تم.........

کھنکتا ہے وہ پہلا دن تو سارا
کہیں سے رات کھوئی ہو گئی ہے
وہ اب بھی ہنستی رہتی ہے مسلسل
چھما چھم بھاگتی ہے ٹوٹتی ہے
کبھی ناراض ہو جائے تو اب بھی
وہ فوراً پھلجھڑی سی چھوٹتی ہے
مگر آواز موئی ہو گئی ہے

تکلف سے پرے ہے اب بھی لہجہ
نگاہوں میں وہی بے باکیاں ہیں
وہی ناپ اس کی چوڑیوں کے
اشاروں میں وہی گولائیاں ہیں
خیالوں میں ہے اب بھی بھول پن سا
مگر ہر بات موئی ہوگئی ہے

گیت ہندی شاعری کی دین ہے اردو میں گیت نگاری کا آغاز کہاں کب اور کیسے ہوا۔ اس کے لئے دور تک جانا ہمارے لئے ضروری نہیں ہے۔ ہاں اس بات میں کوئی شبہ نہیں کہ گیت اردو میں ہندی کے اثر سے پیدا ہوا۔ زبیر رضوی لکھتے ہیں کہ:

''ہندی گیتوں کی لے پہلی بار اردو میں نظیر اکبرآبادی کے یہاں سنائی دیتی ہے''

پریمی رومانی ماہنامہ ''سہیل'' گیا کے اگست ۱۹۸۶ء کے شمارے میں اردو گیت کے بارے میں لکھتے ہیں:

''حقیقت تو یہ ہے کہ اردو شاعری میں گیت کے واضح نقوش پہلی بار امانت لکھنوی کے ڈرامہ اندر سبھا میں ملتے ہیں، بیسویں صدی میں ن۔م۔راشد، میراجی، حفیظ جالندھری، ساغر نظامی، مقبول احمد، عبدالحمید بھٹی، قتیل شفائی، شکیل بدایونی، ساحر لدھیانوی، سلام مچھلی شہری، مجروح سلطانپوری، بکل اتساہی، تاج سعید، مجید امجد، تنویر نقوی وغیرہ نے اس صنف کو آگے بڑھایا۔ حالیہ برسوں میں زبیر رضوی، منیر نیازی، ناصر شہزاد، کرن موہن، بمل کرشن اشک وغیرہ نے بہت اچھے گیت لکھے اور اس صنف کو ایک مستقل صنف بنانے کی کوشش کی۔ ندا فاضلی نے اردو گیت کو ایک نئے آہنگ اور معنویت سے آشنا کیا ہے، ان کا کمال یہ ہے کہ وہ گیت میں مشینی دور سے لی گئی زبان اور لہجے سے کام لیتے ہیں، ان کا لہجہ نرم کومل اور احساسات سے بھرپور ہے، اس لہجے سے وہ اکثر جگہوں پر نازک

احساس کو جگاتے ہیں''۔

پھولوں کے رنگ لال لال چلنے میں روکیں
ہزاروں سے ٹوکیں موسم خوابوں کا پوچھے سوال
برکھا کے ہاتھوں سے دھوئی ہوائیں
پیڑوں میں چھپ چھپ کے اودھم مچائیں
مہندی کا بوٹا دکھا کے انگوٹھا
بھیگے دوپٹے ہیں لاکھوں کا مال
پھولوں کے رنگ لال لال

ندا فاضلی نے اپنے گیتوں میں زندگی کی رمق، شہروں کی گھٹن، گاؤں کی فضا، سب کچھ اپنے گیتوں میں سمودیا ہے حد تو یہ ہے کہ ان کی غزلوں میں بھی اکثر گیتوں کا رنگ پایا جاتا ہے، بہت سی غزلیں ایسی ہیں جن میں پورا گیت کا اثر ہے، مثال کے طور پر ان کی ایک مشہور غزل ہے جسے گیت نما غزل کہہ سکتے ہیں۔

پیا نہیں جب گاؤں میں
آگ لگے سب گاؤں میں
لکھنے والے آ گے لکھ
لوٹو گے کب گاؤں میں
کتنی میٹھی تھی املی
ساجن تھے جب گاؤں میں
سچ کہہ گویاں اور کہاں
ان جیسی چھب گاؤں میں
ان کے جانے کی تاریخ
دنگل تھا جب گاؤں میں

دیکھ سکھی دھیمے بول

بیری ہیں سب گاؤں میں

☆

اس کے علاوہ بہت سی نظمیں بھی ان کے یہاں پائی جاتی ہیں، جو گیت نما ہیں اسکی وجہ یہ ہے کہ ندا فاضلی زیادہ تر ہندی ادیبوں میں رہے ہیں، ہندی ادب کا بھرپور مطالعہ کیا ہے، اسی لئے ان کی ابتدائی شاعری پر ہندی کا غلبہ ہے یہاں ایک نظم کے کچھ بند پیش ہیں، جو ہندی کے بھرپور غلبے کی وجہ سے گیت لگتے ہیں۔

بیٹھے بیٹھے اوب رہے ہیں
آؤ سہیلی سرپٹ بھاگیں
سر کے بال تلک کھل جائیں دھم دھم
یوں دہلیز میں لانگیں
گھٹنوں گھٹنوں تال میں چل کر
منہ تک گاگر بھر لائیں
اور نشانے تاک کر
پتھر سے پتھر ٹکرائیں
برگد کی ننگی ڈالی پر
بن جھولے کے ایسا جھولیں

اس کے علاوہ بہت سی نظمیں بالکل ہندی کے رنگ میں ہیں اور گیت کی طرح لگتی ہیں اور یہی نہیں کہ صرف نظمیں بلکہ غزلوں میں بھی گیت کا سا انداز پایا جاتا ہے، یہاں ایک اور غزل کے چند اشعار دیکھئے۔

ساجن جنگل پار گئے ہیں چپ چپ راہ تکوں
بچھیا بیٹھی تھان میں اونگھے کس سے بات کروں

بن سا جن کے کچھ بھی نہ سہائے بیٹھے رہنا کام
آنگن کے جامن کو باچوں یا دیوار پر چڑھوں

رات اندھیری کاٹے کھائے ہوا چلائے تیر
میرا بس ہو تو میں انکو بھی جانے دوں

جانے ان بن کیا ہو جاتا ہے میرے جی کو
چوکا باسن کر پاؤں نہ چکی پیس سکوں

ماہنامہ ''سہیل'' گیا میں پریمی رمانی لکھتے ہیں:

''ندا فاضلی کے گیتوں میں زمینی تشبیہات وجد آمیز ملتی ہیں، اس کا مطالعہ کرتے ہوئے تمام پر پیچ راہیں خود بخود کھلتی ہوئی نظر آتی ہیں، وہ اپنے اشعار میں مصوری کرتے ہیں، ان کے گیت پڑھ کر ایسا لگتا ہے جیسے خود بخود روح کی پیاس منجمد رہی ہو، بیلوں کی سی آنکھیں ،دھرتی کی چھاتی ،جل دھارا گونگے بہرے سناٹے ، ریت بنی جل دھارا ، آنگن آنگن جلتی جوالا ، ننگے سارے بول وغیرہ۔ جیسی مرکبات استعمال کر کے وہ ایک نئی دنیا آباد کرتے ہیں ،وہ اپنے مخصوص سیاق وسباق ان تراکیب کا استعمال اس قدر مصورانہ ہے کہ حسین رنگوں کے آمیزش سے بنی ہوئی خوبصورت اور پرشکوہ تصویریں گھومتی نظر آنے لگتی ہیں۔ یہ خصوصیت مثلاً ''

بیلوں کی شبینہ آنکھوں میں پتھر پتھر بادل
کٹی پھٹی چھاتی
دور دور تک جنگل
پربت پربت وادی وادی

ویرانی ویرانی
بڑی دیوانی
لوہارن لوہے کو پیٹے
لگے ہتھوڑا من پر

اس کے علاوہ بہت سے گیتوں میں ندا نے گیت کو نیا موڑ دیا ہے اور گیت کو گاؤں کی سرسبز وادیوں سے نکال کر شہر کی ان مشینوں، ہنگاموں میں لے آئے ہیں۔ جس سے کہ آج کے دور کے انسان دوچار ہے، ان کے گیتوں میں گاؤں کی ندیاں، وادیاں، جھیلیں پربت گوری کے علاوہ زندگی کی وہ سچائیاں بھی ملیں گی، جہاں کارخانوں مشینوں میں گھرا انسان اپنی روزمرہ کی زندگی میں جن حالات کا شکار ہے، سب کچھ ان کے گیتوں میں ملے گا اور ایک اچھوتے انداز میں ۔

جنگل بنجاروں کے میت
دیواروں کے گھر کیا جانیں موسم کے سنگیت
ہاتھ میں لے کر آگ نہائے
بیچ ندی میں رات
میلوں دور سے دھرتی سن لے
نیل گگن کی بات
سوکھے پھول مسکائے
کوئی ہار نہ جیت
جنگل بنجاروں کے میت
تتلی کے اڑتے رنگوں میں
ساون جھولا ڈالے
ہوا اکیلی رستہ بھولے

دیپک بالے

☆

ندا فاضلی کی ایک عمر ہندی شعراء کے ساتھ گذری ہے۔ ایک تو ہندی شعراء کی قرابت داری میں ہندی کا مطالعہ ندا نے بہت کیا ہے، یہی وجہ ہے کہ ندا فاضلی کی شاعری پر ہندی کا اثر گہرا ہے اور یہ ایک سچائی بھی ہے کہ جس شاعر کے ذہن میں اپنی زمین کی خوشبو بس گئی ہے، میرا خیال ہے کہ جو شخص ہندوستان میں پیدا ہوا، ہندی شاعری سے متاثر ہوا، اس کا احساس شاعری ہے وہ۔ ندا فاضلی نے ہندی ادب کا بہت مطالعہ کیا ہے اور زیادہ تر ہندی ادیبوں کے ساتھ رہے ہیں، ان سے گفتگو کی ہے اور بحثیں کی ہیں اور اس بحث اور اس مطالعہ کا اثر ہے کہ ان کی شاعری میں ہندی زیادہ ہے۔ دھرتی، آکاش، دیپ، چاند، گاؤں، بہرہ، سہل، بادل، سنسار، آنگن، پربت اس طرح کے بیشمار عنوانات ہیں۔ جن پر ندا فاضلی نے گیت لکھے، ان الفاظ کا زیادہ سے زیادہ استعمال کیا ہے۔ جو بہت خوبصورت لگتے ہیں۔ ڈاکٹر رفیعہ شبنم عابدی لکھتی ہیں:

"ندا فاضلی کے گیتوں میں دھرتی کی بوباس ہے، گاؤں کی زندگی کا حسن ہے، موسموں کی دلکشی ہے، اور ان کے جذبات کی قدر ہے اور وہ پہلی بارش کے بعد زمین کو مہکا دیتا ہے، ان گیتوں کا ایک احساس جاگتا ہے جیسے جاڑوں کا موسم ہے اور دور کہیں ہلکے ہلکے شعلے اٹھ رہے ہیں۔ ساون کا مہینہ ہے، آسمان پر بدلیاں چھائی ہیں اور ہلکی ہلکی رم جھم کھتوں کھلیانوں کو شاداب کر رہی ہے، آموں کے پیڑوں پر کوکتی کوئل کے نغمے جیسے گیت ہیں، ندا کے تصورات دلکش دلکش بناتے ہیں اور ابھرتے ہیں اور خوبصورت اور دلکش مثلاً ہاتھ میں آگ لئے ندی میں بیچ نہاتی ہوئی رات، تتلی کے اڑنے سے، انگنوں میں جھولا ڈالنے والا ساون، برکھا کے ہاتھوں سے دبی ہوئی ہوائیں، انگوٹھی دکھاتا ہوا مہندی کا بوٹا، آنچل سے نہ ڈھکتی سوتی ہوئی دوپہری، وہ ہندوستان کے دیہاتوں کی ساری دلکش، ان

گیتوں میں سما گئی ہے، اگر ہم رو رو کے تمام ادبی سرمایہ پر نظر ڈالیں، تو یہ بات واضح ہو جائے گی کہ اردو میں سب سے زیادہ غزل لکھی گئی اور یہ بات بھی کسی سے پوشیدہ نہیں کہ اردو کے بڑے بڑے شاعر ہوئے ہیں۔ مرزا غالب کو چھوڑ کر سب کے سب نظم کے ہیں، یعنی جب بھی کوئی شخص اپنی شاعری کی ابتدا کرتا ہے تو سب سے پہلے غزل ہی کو اپناتا ہے، لیکن ندا فاضلی نے نہ صرف نظمیں لکھیں بلکہ دوہے اور گیت بھی بہت اچھے لکھے ہیں۔ یہاں چند گیت پیش ہیں جنھیں پڑھ کر اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ندا نے اپنے گیتوں میں زندگی کی حقیقتوں کے ساتھ ساتھ اپنی دھرتی سے رشتوں کا اظہار بھی بڑی خوبصورتی کے ساتھ کیا ہے۔'' ؎

کئی دنوں سے چاند اگا
نہ سورج نکلا
جب سے تم پردیس گئے ہو
بہت اندھیرا ہے
رات رات بھر پانی برسے
دھول اڑے دن دن بھر
سو یا اب لوہے کو پیٹے
لگے ہتھوڑا من پر
بڑھئی بچارا لکڑی چیرے
میں دیکھوں اٹھ اٹھ کر
نئی صراحی میں پانی
ندیا جیسا ہے
جب سے تم.........
ابھی ابھی ٹوٹے گا پیالہ

تو پھر خود جڑ جائے گا
مڑ کر دیکھا تو
پنجرے میں بیٹھا پنچھی اڑ جائے گا
کیسے کیسے نئے وچاروں نے آگھیرا ہے
جب سے تم..........

اردو شاعری میں ندا فاضلی نے اپنے گیتوں کے ذریعہ سے پہچان قائم کر لی ہے، پریمی رومانی کہتے ہیں:

"ندا فاضلی نے اردو گیت کو ایک نئے آہنگ او معنویت سے آشنا کیا ہے، ان کا کمال یہ ہے کہ وہ گیت میں مشینی دور سے لی گئی زبان اور لہجہ سے کام لیتے ہیں، ان کا لہجہ نرم، کومل اور احساسات سے بھرپور ہے، ان کی زبان فارسیت کے اثر سے آزاد ہے، وہ سادہ آسان اور روزمرہ بولی جانے والی تخلیقی لمس عطا کرتے ہیں، ان کا لب ولہجہ سب سے جداگانہ ہے، یہی وجہ ہے کہ ان کے گیتوں میں عمل اور ردعمل دونوں کیفیات ملتی ہیں، ندا فاضلی اپنے گیتوں میں وقت کا بروقت سریلا راگ الاپتے ہیں، وہ راگ جس میں محبت کا تاثر بھی ہے، محرومی کی کھنک بھی ہے اور انقلاب کی پکار بھی، ان کے گیت اس انسان کے نازک جذباتی اتار چڑھاؤ پیش آتے ہیں۔ جو شہروں کی مصروف کاروباری زندگی میں سانس لینے پر مجبور ہوئے ہیں۔ ندا فاضلی نے گیت کے کینوس میں ایک وسیع دائرے میں زندگی کی بڑی حقیقتوں کو سمیٹ لیا ہے، وہ گیت کے ان تخلیق کاروں میں سے ہیں، جنھوں نے اس صنف کو تکنیک سے آراستہ کیا ہے اور اس میں جوش وولولہ اور دلکشی کے علاوہ گداختگی اور گرماہٹ پیدا کی ہے، ندا فاضلی کے گیتوں میں جہاں حسن بخش رقص ملتا ہے، وہاں جدوجہد حیات کی تڑپ پائی جاتی ہے، ان گیتوں کی یہ بھی خصوصیت ہے کہ ہر انسان کو اپنی

دھڑکن سنائی دیتی ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے گویا اس کے اندر کی آواز ہے، ان گیتوں میں پختہ کاری بھی ہے اور جذبات نگاری بھی ہے''۔

ہر مٹھی میں الجھا ریشم ڈورے بھرا ڈورا

باہر سو گانٹھوں کے تارے کاغذ کورا

جیون بھر اسنا نا

☆

ڈھلتا سورج دن لے جائے چندا رات چرائے

سانسوں کا انمول خزانہ یگ یگ لٹتا جائے

لٹیرا لوٹے ہر انگنائی

سمے سے کون لڑا ہے بھائی

ایک روپئے کے سول آنے دو آنے کا مول

بھائی بہن اور پورب پچھم

ماتا پتا بے زار گھونگھٹ میں سمٹی خاموشی

اردو ادب کا اگر سب سے زیادہ سرمایہ ہے، تو وہ ہے غزل دو دھاری تلوار، اردو کے ہر شاعر نے غزلیں سب سے زیادہ لکھیں اور آج تو نثری نظمیں روز بروز اتنی تیزی سے لکھی جا رہی ہیں کہ بعض ہندی نظموں اور اردو ادب کی دیگر اصناف مشکل ہیں، اس میں چند شعراء ہی اپنا مقام بنا پائے ہیں، ندا فاضلی نے اوروں کی طرح گیتوں میں بھی اپنی انفرادیت نہ صرف قائم رکھی ہے، بلکہ ایک اچھے گیت کار کی حیثیت سے ان کا نام لیا جاتا ہے، اس سلسلے میں ڈاکٹر وزیر آغا نے اپنی کتاب ''اردو شاعری کا مزاج'' میں اردو شاعری کے تین اہم اصناف گیت، غزل اور نظم کا ترتیب وار جائزہ لیا ہے، گیت کو اول نمبر پر اس لئے رکھا ہے کہ غزل اور نظم اس کے بعد کی پیداوار ہیں، گیت کی پیدائش کی تاریخ بہت پرانی ہے، گیت زمین اور جنگل کی پیداوار ہے، رقص اس کے اضافی پہلو ہیں، یہ عورت مرد

کے لئے والہانہ اظہار ہے۔ اسی طرح عبدالقادر سہروردی نے اپنی کتاب "غنائی شاعری" میں گیت کے بارے میں لکھا ہے کہ:

یہ گیت وہ نظمیں ہیں، جو عموماً موسیقی اور رقص کے ساتھ منسلک کی جاتی ہیں اور اس میں زیادہ تر حسن وعشق کے داخلی جذبات وواردات کا بیان ہوتا ہے"۔

گیت عموماً زیادہ تر غور وفکر کا نتیجہ نہیں بلکہ جوش جذبات اس کے ماخذ ہیں، لیکن ندا فاضلی نے اپنے گیتوں میں غور وفکر سے بھی کام لیا ہے، ان کے گیت نہ صرف حسن وعشق کے جذبات پر منحصر ہیں، بلکہ جنسیات، برکھا، پردیس، برہ، گاؤں اور مشینی زندگی بھی، گھمسان کی زندگی کے مسائل کی بھرپور عکاسی بھی کرتے ہیں۔ ندا فاضلی نے اپنے گیتوں میں روزمرہ بولی جانے والی زبان سادہ الفاظ اور آسان لہجہ اختیار کیا ہے، یہی وجہ ہے کہ ان کے گیت دلوں پر اثر کرتے ہیں اور ہر سننے والے کو متاثر کرتے ہیں۔

جنگل بنجاروں کے میت
دیواروں کے گھر کیا جائیں پریم کے سنگیت
ہاتھ میں لے کر آگ نہائے
بیچ ندی میں رات میلوں دور سے دھرتی سن لے نیل
گگن کی بات
سوکھے پھول کلی مسکائے
کرتی ہار نہ جیت
جنگل بنجاروں کے میت
تتلی کے اڑتے رنگوں میں ساون جھولا ڈالے
ہوا اس کی رستہ بھولے
جگنو دیپ پائے

بیج میں انکر بن کر پھوٹیں
نغموں کے گیت
جنگل بنجاروں کے میت

ندا فاضلی نے اپنے گیتوں میں اپنے دیش کی مٹی سے رشتہ پیدا کیا ہے، اور جنسیات پر بھی لکھے ہیں، وہ کسی اور گیت کار کے یہاں نظر نہیں آتا، ندا فاضلی کے پہلے مجموعہ کلام ''لفظوں کا پل'' میں صرف نظمیں ہی نہیں گیت بھی شامل ہیں، گیتوں میں ہندی انداز سخن کو ایک حربہ کے طور پر اپنایا گیا ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ گوالیار میں اپنے قیام کے دوران ندا صاحب کا ادبی حلقہ ہندی والوں کا تھا اور ہندی ادب کا موصوف نے گہرا مطالعہ بھی کیا ہے گیتوں میں گاؤں کی بولی اور کھیت کھلیانوں کی بھینی بھینی خوشبو گاؤں کے موسم اور وہاں کی فضاؤں کے ساتھ ساتھ جنسی لاابالی کا ذکر ملتا ہے، ان میں ہندی گیتوں کی نشانی نام کو نہیں ہے، ندا صاحب کی انفرادیت ہر گیت میں موجود ہے۔

کھنکتا ہے وہ پہلا دن تو سارا
کہیں سے رات کھوئی ہوگئی ہے
وہ اب بھی ہنستی رہتی ہے مسلسل
چھما چھم بھاگتی ہے ٹوٹتی ہے
کبھی ناراض ہو جائے تو اب بھی
وہ فوراً کھڑکی سے چھوڑتی ہے
وہ باتیں اب بھی کرتی ہے برابر
مگر آواز موئی ہوگئی ہے
تکلف سے پرے ہے اب بھی لہجہ
نگاہوں میں وہی بے باکیاں ہیں
وہی بے ناپ اسکی چوڑیوں کا

اشاروں میں وہی گویائیاں ہیں
خیالوں میں ہے اب بھولپن سا
مگر ہر بات چھوٹی ہو گئی ہے
مرادی اب بھی گر جاتی ہے اس سے
وہ اب بھی کچے تاگے کاتتی ہے
وہ گھر میں سب سے پہلے جھانکتی ہے
مسالہ اب بھی موٹا پیستی ہے
مگر پتلی گول روٹی ہو گئی ہے
کھٹکتی ہے وہ پھیلاؤں تو سارا
کہیں سے رات کھوٹی ہو گئی ہے

اس طرح کے بہت سے گیت ہیں، جن میں ندا فاضلی نے اپنے فن کے ذریعہ انھیں جدت کے نئے نئے نمونے دکھائے ہیں اور گیتوں میں تک تجربات کئے ہیں۔ انور خان ایک جگہ لکھتے ہیں:

"ندا فاضلی کے یہاں مسلسل سفر کا احساس ہوتا ہے، جب انھیں احساس ہوتا ہے کہ وہ ٹھہر گئے ہیں تو پھر نئی منزلوں کی تلاش میں نکل پڑتے ہیں، نظم، غزل، گیت، اور دوہے پر انھیں یکساں قدرت ہے۔ گیتوں کو انھوں نے ایک نیا موڑ دیا ہے، ہلکے پھلکے رومانی گیتوں سے آگے بڑھ کر انھیں عصری حسّیت سے روشناس کروایا ہے، ادھر انہوں نے بہت اچھے دوہے کہے ہیں، ان کی شاعری میں میر و غالب اور سودا و آتش کے ساتھ، میرا، کبیر اور تلسی داس کی شعری روایتیں ایک خوبصورت روپ اختیار کرتی ہیں، جو ان کی شاعری کا شناس نامہ ہے۔ اپنے گھر کے سنگین اور تلخ حقائق کا اظہار انھیں جدید شاعروں میں ایک منفرد مقام عطا کرتا ہے ان کی شاعری ایک ذہین قاری کے دل و دماغ کو مہمیز

کرتی ہے اور اس کے تجرباتی ذوق کی آبیاری کرتی ہے۔"

ندا فاضلی نے اپنے گیتوں میں زندگی کی سچائیاں، گاؤں، شہر، دھرتی سے ایک مضبوط رشتہ کو بڑے خوبصورت انداز میں پیش کیا ہے، اپنے لہجے کی انفرادیت کو قائم رکھا جیسے کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے کہ ان کی پوری شاعری پر ہندی کا غلبہ ہے، ان کی جب ندا فاضلی کا ہندی شعراء اور ادیبوں کے ساتھ زیادہ وقت گذرا ہے بلکہ اس سلسلے میں ندا فاضلی ایک جگہ خود لکھتے ہیں:

"بی۔اے کے پہلے سال میں ندا کو مجبوراً اردو کے بدلے ہندی لیتی پڑی، ان کا خالی وقت لائبریری میں گذرا ہے، لائبریری میں بھی ان کتابوں کے ساتھ جن کا تعلق شاعری سے ہے، یہ شاعری کی کتابیں داغ، معاصرین اور ان کے شاگردوں تک محدود ہیں، زبان کے اشارے کے ساتھ، سیدھی شوخ باتیں اچھی لگتی ہیں۔ایک تو ندا فاضلی کو مجبوری کی وجہ سے ہندی لیتی پڑی اور پھر یہی مجبوری ان کا شوق بن گیا اور اسی شوق نے ایک دن انہیں ایک اچھا گیت کار بنا دیا۔"

بیت گئی رات، بیت گئی رات
کھلی ندیا کے پانی میں پہلی کرن
املی سے توتے نے پھینکے کتارے
آنگن سے دو پڑے سانجھ سکارے
پیتل کی ٹونٹی سے گرتے ستارے
بیت گئی رات، بیت گئی رات
بندھے کا جل کے ڈورے چنچل ہرن
کرسی کے ہتھے پہ چائے کی پیالی
کھانسے گی گریں دوں گی گالی
چھوٹ گئی ہاتھوں سے پوجا کی تھالی

بیت گئی رات، بیت گئی رات
گھنی پلکوں کے سائے میں چمکے نین
کھلی ندیا کے پانی میں پہلی کرن

ندا فاضلی کے گیتوں کی خوبی ایک یہ بھی ہے کہ وہ جیسا گیت لکھتے ہیں، اس کے لئے الفاظ بھی ویسے ہی استعمال کرتے ہیں، مثلاً وہ گاؤں کی منظر کشی کریں گے تو زبان بھی وہی استعمال کریں گے اور اگر وہ شہری زندگی سے متعلق کوئی گیت لکھیں گے تو اس کے لئے الفاظ دوسرے ہوں گے، سادہ لہجہ میں سادہ الفاظ میں گیتوں کو اور بھی نکھار دیتے ہیں۔

ہری ہری گھاس
چلی سن سن ہوا
بھرا منہ تک کٹورے سا تال
شیشے کی پیالی سا چھن سے گرا کچھ
بچوں کے تلووں سا من میں ہوا کچھ
مٹکے کے پانی سا ٹھنڈا لگا کچھ
تھم تھمی سانس
کبھی زینہ چڑھوں کبھی سہلاؤں پل کے بال

ہری ہری گھاس
گھوڑے کی ٹانگوں میں ناگن کا پھندا
لکڑی کی تختی پہ چوہے کا رہنا
اڑنے کی کوشش میں زخمی پرندہ

نئی نئی باس
کھلے شہدوں کے دوار
اڑے زنجیر پہلے خیال

ہری ہری گھاس
چلی سن سن ہوا

ان گیتوں میں ندا فاضلی نے جو الفاظ استعمال کیے ہیں، مثلاً مٹکے، کانسی کا گھر، املی، طوطے، کٹورے، سہلاؤں بلی کے بال، ٹونٹی، کاجل، چنچل ڈورے وغیرہ سینکڑوں ایسے الفاظ جو روزمرہ کی بہترین مثال کہہ سکتے ہیں۔ جس گیت میں جتنا تقاضا ہے اس میں وہی الفاظ استعمال کرکے ندا فاضلی نے گیت کے فن کو ایک نئی جلا بخشی ہے۔

تجھ بن مجھ کو کیسے کیسے چھیڑے کالی رات
کھٹیا پیچھے چوڑی کھنکے دو آوازیں ساتھ
جامن پہ، چھم سے آبیٹھی
کوئی پرائی بات
سونا آنگن
کرن، بتاؤ ریشم ہاتھ
تجھ بن نیل گگن
بادل کے ٹکڑے
کیا روپ بنائیں
اڑتا آنچل کھلتا جوڑا
ننھی ننھی باہیں
جلتا چولھا بھری کڑاہی بنی بجی رات
تجھ بن مجھ کو.........

اس گیت میں ندا فاضلی نے اس برہ ماری کی حالت کو کس طرح اور کس ڈھنگ سے پیش کیا ہے، جلتا چولھا، بھری کڑاہی، بنی بجی برسات، یہ سب اسے بے مزہ لگتی ہیں، کھٹیا پیچھے چوڑی کھنکنا یہ سب کچھ پختگی سے گیت میں پیش کردیا ہے۔

گیت پڑھ کر یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ ندا فاضلی کس مرتبہ کے گیت کار ہیں، ندا فاضلی نے بے شمار موضوعات پر گیت لکھے، گاؤں، شہر، جلن، بادل، برسات، رات، موسم، ہر طرح کے گیت لکھے اور ہر گیت میں ایک منفرد چھاپ چھوڑی۔ پریمی رومانی لکھتے ہیں:

''ندا فاضلی کے گیتوں میں علامتی اسلوب ملتا ہے، انہوں نے اپنے گیتوں میں سلیس اور رواں زبان جدید تکنیک استعمال کی ہے، اور وہاں اشاریت کے پہلو میں اجاگر ہوتے ہیں، اس کے علاوہ انھوں نے لوک شاعری کا رنگ بھی اس میں بھر دیا ہے، جس سے ان کے گیت زیادہ سریلے خوشبودار اور سدابہار بن گئے ہیں، ندا فاضلی نے اپنے گیتوں میں مرقع کاری کے اچھے اچھے نمونے پیش کئے ہیں، انہوں نے نیا اسلوب اپنا کر ماضی کے دھندلکے کو درخشاں کرنے کی کوشش کی ہے، اس کی ایک اور وجہ یہ ہے کہ ان پر انگریزی اور ہندی شاعری کا بھی براہ راست اثر ہے۔

ندا فاضلی کے گیت سریلے صاف اور خوشنما ہیں، ان کے گیتوں میں افسردگی، تحیر، گھٹن، آرزومندی، ترنم اور غنائیت یہ سب کچھ ملتا ہے، مختصر یہ کہ ندا فاضلی نے گیت کو فروغ دینے میں جوئی تراکیب نئے تجربے اور اخلاقی اسلوب اپنایا ہے، وہ ان ہی کا کام ہے، ان کی غزلوں میں بھی گیت کی ہی کیفیت پائی جاتی ہے، محبت سے گہری عقیدت اور بے یقینی کا عالم احتیاط کا دم اور غم کی تلخی ندا فاضلی کی شاعری کے خاص موضوعات ہیں، ان کی شاعری میں یہ موضوعات شدت سے محسوس کئے جاتے ہیں۔''

یہ گیت دیکھئے جس میں ایک عجیب سی شدت اور منفرد انداز ہے۔

بادل بادل پیاس پکارے\
پانی دے او پانی\
پیاس بڑی دیوانی

پتھر پتھر چھینٹے

رات بنی جل دھارا

گونگے بہرے سنّاٹے

میں چیخ چیخ کے ہارا

اتر دکھن پورب پچھم

ہوا کرے من مانی

پیاس بڑی دیوانی

پانی رے او پانی

بیلوں کی شیشہ آنکھوں میں پتھر پتھر باد

کٹی پھٹی دھرتی کی چھاتی

دور دور تک جنگل

پربت پربت وادی وادی

ویرانی ویرانی

پیاس بڑی دیوانی

پانی رے او پانی

گیتوں کی روایت اتنی پرانی ہے، جتنی کہ زبان وزیر آغا کہتے ہیں:

''گیت مزاجاً روایت کے غنائی اظہار کی ایک صورت ہے، ثقافتی لحاظ سے اس کا نہایت گہرا تعلق زمین سے ہے اور زمین عورت سے مشابہ ہے، جب بھی کوئی زبان سامنے آتی ہے تو اس کی ابتدا شاعری سے ہوتی ہے اور یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ گیتوں سے اس کی ابتدا ہوئی، جب انسان پر کوئی کیفیت طاری ہوتی ہے، تو وہ ناچنے لگتا ہے، رقص کرنے لگتا ہے اور کبھی رقص کے دوران اس کی زبان سے ایسے گانے نکلنے لگتے ہیں جو شاعری ہوتی ہے، گیت ہوتے ہیں، کبھی

موسم کی خوشگواری سے متاثر ہو کر آدمی گنگنانے لگتا ہے۔''

گیتوں کی کئی قسمیں ہوتی ہیں، موسم پر برسات پر، تہوار، جدائی ملن وغیرہ۔ بسم اللہ بیگم لکھتی ہیں:

''دیہاتی گیتوں میں موسموں کا بڑا اثر ہے اور موسم بھی جیسے برسات کے بادل، اندھیری راتیں، بجلی کا کوندنا، ہلکی ہلکی پھواریں، مور، پپیہے اور کوئل پیہوں پیہوں بولنا اور پھر پریتم پردیس میں ہے، اس کا ہمہ تن انتظار ہے اور انتظار بھی کیسا۔ ایک شب کا نہیں مہینوں کا اور انہیں اوقات برسوں کی فرقت کی ستائی ہوئی عورت جنگل کی راتیں بتاتی بلکہ وہ اپنی ہم جولیوں ہم جنسوں میں رہتی ہے، جو اسے تسلی دیتی رہتی ہیں اور ڈھارس بندھاتی ہیں، گیتوں میں ہم یہ تمام کیفیات و ماحولیات پہ اس جگہ سے نظر کریں گے، ان تمام باتوں کی روشنی میں ندا فاضلی کے گیتوں کا اگر جائزہ لیا جائے تو وہ ایک نہایت کامیاب اور بہترین گیت کار ہیں، چاہے وہ ہوا ہو، موسم ہو، جوانی ہو، برسات، ساجن غرض کہ کوئی پہلو ایسا نہیں جو گیتوں میں نہ ہو، گاؤں کی پگڈنڈیوں سے کھیت کھلیان کی سیر کرتا ہوا ان کے یہاں شہروں کی بستی زندگی میں مل جاتا ہے''

کچھ اور گیتوں کے اقتباسات پیش ہیں۔

نہا گئیں ڈالیں کھجوریں کی\
پھک گئے پتھر پہاڑوں کے\
بالوں کو بکھیرتا کپڑے بگاڑتا\
مٹی میں دبے دھنسے پتھرا کھاڑیں

جی چاہا دوڑ پڑیں\
چیخیں دھاڑیں\
سنوا گئے پیچھے جھروکوں میں

موسم کنڈی سنگھاڑوں میں
نہا گئیں ڈالیں، کھجوروں کی
چھک گئے پتھر پہاڑوں کے
نہا گئیں ڈالیں ....
اٹھلاتی ہوئی کلیاں
شرماتے ہوئے آنگن
سمٹی ہوئی چوکھٹ پر ایک دھوپ کی بلی سی
نیبو کی کیاری میں چاندی کے کئی کنکر

یہی وہ حالات تھے، جن کا شکار ندا فاضلی ہوئے اور ہندی غزل کی طرف رجوع ہوئے اور اردو کے ایک بہترین گیت کار کی حیثیت سے نمایاں ہوئے، آج ان کے گیت ہندی والوں اور اردو دانوں میں یکساں مقبول ہیں۔ دیکھئے

بڑا مزہ آیا لڑائی میں
ٹوٹ گئیں چوڑیاں کلائی میں
شربت سے میٹھے، دوائی سے کڑوے
سیاں غضب کے شریر
گیلے اندھیروں میں چھو کے نشانہ
برسائیں تیروں پہ تیر
دھواں دھواں موسم رضائی میں
بڑا مزہ آیا لڑائی میں
ٹوٹ گئی چوڑی کلائی میں
ریشم کے گچھے سا سلگتا سویرا
اجلے ہواؤں کے چہرے

نیلے اندھیرے گلابی اجالے

بادل سنہرے سنہرے

نیا نیا پانی ترائی میں

بڑا مزہ آیا ترائی میں

اس گیت میں ندا فاضلی نے نہ صرف موسم برسات کی آمد کی کیفیات کو بیان کیا ہے بلکہ وہ تمام جذبات کی بھرپور عکاسی اور ترجمانی کی ہے، جب گاؤں کی سرسبز وادیوں میں برسات اپنے البیلے انداز سے آتی ہے، تو کیا حالت ہوتی ہے کیا کیفیت ہوتی ہے۔ ظاہر ہے کہ گیتوں کا تعلق برسات سے ہوتا ہے۔ ندا فاضلی نے اپنے ہر گیت میں سب کچھ سمو دیا ہے۔

جھکے ہوئے کندھوں پہ سانسوں کی گٹھری

رستوں میں نوکیلی گھاس

چائے کے پیالوں میں ماتھوں کی شکن

کٹی ہوئی کرسیاں

سرحد، سپاہی، گیہوں، کبوتر

اخبار کی سرخیاں

سگریٹ کی کی ڈبیوں میں بند سویرا

لوکل ڈبوں میں شام

لڑتا جھگڑتا کوئی کس سے

ہے بات کوئی جیسے ساگر کنارے لہروں پہ کوئی

کنکرے حملہ کرے، لمبی سی رسی پہ کھڑے ہی کپڑے

کپڑوں کے کونوں میں نام

جھکے ہوئے کندھوں پہ سانسوں کی گٹھری

رستوں میں نوکیلی گھاس

اردو شاعری کی پوری تاریخ میں گیتوں کی ابتدا سے لے کر آج تک ایسا کوئی گیت کار نظر نہیں آتا، جس نے ایسے ایسے موضوعات پر گیت جن پر ندا فاضلی نے لکھے۔ بسم اللہ بیگم لکھتی ہیں:

''عوام کے اس ادب کے اس خزانے پر جب نظر پڑتی ہے، تو آنکھیں چکا چوند ہو جاتی ہیں اور یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے، ولی سے لے کر نظیر اکبر آبادی کے زمانے تک ایران اور توران کے لولو اور موتیوں سے اپنا دامن بھرا پڑا ہے، ہندوستان کے ان ہیروں کو خاک میں پڑے ہوئے تھے، نہ پہچانا اور پہچانا بھی قابل التفات نہ سمجھا۔

اس بے التفاتی کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ گیتوں کو شاعری کی صف میں کوئی جگہ بھی نہیں دی گئی، ان کو زبان کی شوخیوں کی زبان سمجھا گیا، مضامین کو رکیک اور پست بتایا گیا، طرز، ادا اور اسلوب کو بھونڈا قرار دیا گیا، اور تشبیہات واستعارات میں ندرت نہیں ملی۔ سب بڑا اعتراض گیتوں کی زبان پر ہوسکتا ہے۔ اور کہا جا سکتا ہے کہ گیتوں کی زبان کوئی مشکل زبان نہیں ہے۔ مثلاً جانے کی جگہ، جا، ت، جاب، جیسے وغیرہ شکلیں اختیار کی گئیں۔ شاید اس پر غور نہیں کیا کہ اس طرح ایک ہی لفظ مختلف لہجوں سے ہوسکتا ہے اور گیتوں کی موسیقیت کاری میں پنہاں ہیں۔ مثلاً پریم، پریت، پیا، بالم، بلم، بالماں، بماں، دشیام انورے اور سنوریا کو لیجیے ان حرکت وسکون کی اتنی پابندی نہیں، برخلاف اس مرجہ اردو میں حرکت وسکون کی اتنی پابندی نہیں، برخلاف اس مرجہ اردو میں حرکت وسکون کی اتنی پابندی ہے کہ اس کے لفظ میں تلفظ ذرا بھی تبدیل ہو جائے ذرا بھی تبدیل ہو جائے، تو وہ مضحکہ خیز ہو جائے گا۔

گیتوں کے ایسے مشکل فن کو ندا فاضلی نے ایک نیا موڑ دیا۔

درشن جل کے پیاسے نیناں من کی پیاس دیہہ
پیاس بجھے نہ میری چاہے پورا تال پیوں
آڑی ترچھی ریکھاؤں سے سامری پیلا لال
کب تک بیٹھے بیٹھے ویسے تیسے اور گنوں
جانے دور ہے سورج ان کے چرنوں سے
ایسے میں جو مرغا بولے لاکھ بلائیں لوں

ایک اور گیت دیکھیے جو ماہنامہ ''کہسار'' مارچ اپریل ۱۹۷۹ء میں شائع ہوا تھا

بھاگ رہی کالی راتیں
دوڑ رہے ہیں دن
بدلتا پل پل منظر دے
بوڑھے برگد کی گھنی چھاؤں
ہر ہو باہر اجائے
پکی اینٹوں کا وہ محلہ
تنکوں کا اڑ جائے
تھال کٹورے سونا چاندی
چاہے جتنا گن
کبھی کچھ کنکر پتھر دے
جو پل جائے لوٹ نہ پائے
دیا جلے سو جائے
پھر آنکھیں سپنا دیکھیں
درپن مانگ سجائے
پتا پتا جھڑے بڑھاپا

پھول چنے گم سن
مگر ہر قول برابر دے
بھاگ رہی ہیں کالی راتیں
دوڑ رہے ہیں دن
بدلتا پل پل منظر دے

ندا فاضلی کے گیتوں میں گاؤں کی سبز وادیاں، موسم، شہر، ندیاں، جھیلیں، سین ہندوستان اپنی اپنی دھرتی سے ایک اٹوٹ رشتہ سب کچھ فطری طور پر ہر شخص کے دل کی دھڑکن صاف سنائی دیتی ہے۔ ان کے گیتوں میں ایک عجیب کیفیت پائی جاتی ہے۔

دھوپ بھری چھت پر برس گیا پانی
آنگن میں آ کے
انگیٹھی بجھا کے
ناگن سا لہرا کے، ڈس گیا پانی
گلیوں میں منڈلائیں بادل کے گھیرے
آکاش ڈھونڈیں دو پیڑوں کے چہرے
چھم چھم اجالے چھما چھم اندھیرے
بنا کے تاروں سا
کس گیا پانی
کھڑکی اندھیروں میں کھڑکی کو کھینچے
موسم نہ دیکھے کبھی آگے پیچھے
لیکن گلی اپنی آنکھیں نہ بھینچے
تھانہ کچہری میں پھنس گیا پانی
دھوپ بھری چھت پر برس گیا پانی

یہ وہ گیت ہیں جو ان کی کتاب ''مورناچ'' میں شامل ہیں۔ چند گیت آگے پیش کئے جاتے ہیں، جن میں کس طرح زندگی کی کیفیات کو بیان کیا گیا ہے۔ ڈاکٹر عنوان چشتی نے اپنی کتاب ہیئت کے تجربے میں ایک جگہ لکھا ہے:

''وہ روایات جو اردو شاعری کو فارسی سے ملی تھیں، گیت میں ڈھل کر زیادہ جاندار ہوگئیں، گیت کے ذریعہ اس کو نئے اشعار ملے اور پرانے اشعار ملے، اردو کی وہ آوازیں جو اسے فارسی سے ملیں اور ہندی میں نہیں تھیں، گیت کو بہت راس آئیں اور ان آوازوں سے نغمے پیدا ہوئے، جن سے گیت پہلے آشنا نہیں تھا، غنائی کیفیت اور گیتوں کی ایک اہم خصوصیت ہے۔ اس طرح اردو شاعری کو گیت کی بدولت ایک نیا ذریعہ ہاتھ آیا، ساتھ ساتھ ہندی شاعری کی روایات بھی ملیں، جن میں گھر اور گوکل کی مٹی کا سوندھا پن تھا۔''

سن رے اے پیپل تیرے پتے شور مچاتے ہیں
جب وہ آتے ہیں
پہلا پہلا پیار ہمارا ہم ڈر جاتے ہیں
تیری باہوں میں جھوئی پروائی
میں کب بولی
جب جب برکھا آئی تو نے کھیلی آنکھ مچولی
جب وہ آتے ہیں
نردھن کے گھر پیدا ہونا
جیون کھونا
سونی مانگ سجانے والے مانگیں
چاندی سونا
ہم سیانے ہیں ہمسایوں کے راز چھپاتے ہیں

سن رے پیپل تیرے پتے شور مچاتے ہیں

جب وہ آتے ہیں

ایک اور گیت دیکھئے۔

چندا آگا کے دیکھا و مانجھی

رات جگا کے دیکھ

ہر گم سر گم گیت چھپے ہیں

ساز اٹھا کے دیکھ

یہ جیون ہے بھیا

بھنور بیچ نیا

چلا چل جیسے چلے پروایا

تنکا تنکا جوڑ کے اپنا گھر باندھے گوریا

لہر لہر لہراتے کنارا

ناؤ بڑھا کے دیکھ

نہ کوئی گہرا کہیں کوئی صورت

کہیں کوئی چہرہ، سنہرہ سنہرہ

کہیں کوئی صورت کہیں کوئی چہرہ

کہاں رکھیگا دنیا یہ ساری

چھوٹا کرلے گھیرا

چھوٹے چھوٹے گھروں میں سنسار سجا کے دیکھ

ایک اور گیت دیکھئے۔

اتر دکھن پورب پچھم

الگ الگ ہر دھارا

جگہ جگہ بٹوارا

دکھ کا چہرہ ایک ہی چہرہ

دکھ کے بھیس ہزاروں

میری کٹیا تیرا آنگن

بن گئے دیس ہزاروں

روتی آنکھیں مندر مسجد

ٹوٹا دل گرودوارا

جگہ جگہ بٹوارا

کمرہ کمرہ پوری دھرتی

ہر مجبوری خواب

ایک آنسو مائی کا بھوجن

سو آنسو سیلاب

ٹکڑا ٹکڑا سارا سورج

ثابت سب اندھیارا

جگہ جگہ بٹوارا

یہ وہ گیت ہیں جن میں ندا فاضلی کے اپنے لہجہ کی انفرادیت کی وجہ سے الگ سے پہچانے جاتے ہیں، پریمی رومانی لکھتے ہیں:

"ندا فاضلی کے گیتوں میں قاری اپنے دل کی دھڑکن صاف طور پر محسوس کرتا ہے، وہ ان کو گنگنانے پر مجبور ہو جاتا ہے، ان کے گیتوں کی ایک اور خصوصیت یہ ہے کہ ان کے تراشے ہوئے مصرعوں کی ہم آہنگی اور الفاظ مترنم آواز دلوں میں عزم استقلال کی بے پناہ کیفیت پیدا کرتی ہے، اور گیتوں کی لچک اور مدھرتا ہر جگہ ملتی ہے اور ابتدا سے کوئی مسئلہ پیدا نہیں ہوتا، وہ اپنے محسوسات فوری

طور پر پہنچانے میں کامیاب نظر آتے ہیں، استعارات اور تشبیہات پر پوری طرح دسترس رکھتے ہیں، اپنے گیتوں میں انھوں نے نئی خوبی اور جذبات کی شدت برقرار رکھی ہے ندا فاضلی کے اکثر گیتوں میں جہاں تناظر ہے، وہاں مشاہدے بھی کارفرما ہیں، خارجی اور داخلی عوامل کا پتہ بھی چل سکتا ہے۔ ان کے گیتوں کی انفرادیت اور عظمت کا پورا اندازہ ان کے لہجے اور انداز بیان سے ہوتا ہے۔

کیری میں چمکی کھٹاس
پیڑوں میں جھولے پڑے
چھپ کے پلک چھت گرے
اودھم مچائے جگار
سن سن بھری چیونٹیاں
بستر میں سوئیاں ہزار
مہکی بنولی کی باس
بھیا بہن سے لڑے
پیڑوں میں جھولے پڑے
کچے امرود کے پھول
پھول پہ بھیروں کے کام
بچوں کی آنکھوں سی دھوپ
جنگلی کبوتر کی شام
اکھڑے پڑوسن کی سانس
سوکھے تو پتا جھڑے
کیری میں چمکی کھٹاس
پیڑوں میں جھولے پڑے

ندا فاضلی کے ان گیتوں کی لفظیات دیکھئے کہ انھوں نے وہ الفاظ جو گیت کے لئے ہی وجود میں آئے ہیں، استعمال کر کے گیتوں کی پوری فضا کس طرح قائم کی ہے۔ مثلاً پروسن، جیون، سیر سپاٹا، گانٹھ، کیری، آم، جھانس، پت جھڑ، جنگلی کبوتر، جیسے سیکڑوں الفاظ مل کر ایک ایسی فضا قائم کرتے ہیں کہ خود بخود ذہن میں گیت رقص کرنے لگتے ہیں۔ ایک اور گیت دیکھئے۔ جیون شور بھرا سناٹا

زنجیروں کی لمبائی تک سارا سیر سپاٹا

جیون......

ہر مٹھی میں الجھا ریشم

ڈورے بھیتر ڈورا

باہم سو گانٹھوں کے تالے

اندر کا غذ کورا

کاجل شیشہ پر چھم تارا

ہر سودے میں گھاٹا

جیون شور بھرا سناٹا

چاروں اور چٹانیں حائل

بیچ میں کالی رات

رات کے منہ میں سورج

سورج میں قیدی سب ہاتھ

ننگے پیر عقیدے سارے پگ پگ لاگے کانٹا

جیون......

ندا فاضلی نے اپنا زیادہ تر وقت ہندی کے ادیبوں اور شعراء کے ساتھ بتایا ہے، اور ہندی ادب کا مطالعہ بھی انھوں نے کیا ہے، یہی وجہ ہے کہ ان پر ہندی کا غلبہ ہے گیت

اور دوہے سے ان کا پیار اس بات کا ثبوت ہے کہ جس وقت ندا فاضلی نے گیت لکھنا شروع کیے تو ہندی کے مشہور گیت کار بھی حیران رہ گئے، گیتوں میں بھی انھوں نے اپنی انفرادیت کو شروع سے قائم رکھا بلکہ اس میں اور اضافہ کیا اور نئے نئے موضوعات کو اپنے گیتوں میں پیش کیا، کچھ گیتوں کے نمونے یہاں پیش ہیں ۔

پہلی بوند پڑی پانی کی، ہوا ہوئی سیلانی
ہوا ہوئی سیلانی، جاگی سوئی نادانی
ہرے گلابی سائے چھائے دھوپ چلی عیدانی
نکل پڑیں ہرنوں کی ڈاریں، چھوٹے تیر کمانوں سے
گھر گھر شور کرے من مانی، ہوا ہوئی سیلانی

دھلے دھلائے بچوں سے دن
ہولی کھیلیں راہوں میں
چنے دوپٹوں سے اندھیارے
چھم چھم کھنکیں باہوں میں
سو سو سوانگ رچائے پانی
ہوا ہوئی سیلانی
دھانی پگڑی والا موسم
دھرتی سینچے بادل سے
بیڑی پی کے کھانسے سورج
چندا جھانکے آنچل سے
شور بڑھا کے برکھا رانی
ہوا ہوئی سیلانی
ہوا ہوئی سیلانی جاگی سوئی ہوئی نادانی

ندا فاضلی کے گیت چاہے فطری مناظر پر ہوں یا موسم گاؤں، شہر یا حیات پر ہوں انھوں نے اپنے گیتوں میں سادہ الفاظ استعمال کر گیتوں میں ایک نئی انفرادیت پیدا کی ہے اور سادہ سی زبان کا نتیجہ ہے کہ ان کے گیت آج ہر دل کی دھڑکن معلوم ہوتے ہیں، آج ہر گلی اور کوچے میں ان کے گیت سنائی دیتے ہیں، ندا فاضلی نے اپنی زندگی میں سب کچھ دیکھا ہے، اپنے گھر کو اجڑتے دیکھا، بھائی بہنوں کی جدائی، ماں باپ سے بچھڑنا اور تنہا زندگی گذارنا کتنا مشکل کام ہے۔ یہ سب کچھ ندا فاضلی نے ہنستے ہوئے برداشت کیا ہے، حد تو یہ ہے والد مرحوم کی موت کی خبر آئی تو اسے جھوٹ کہا اور اپنے والد پر ایک نظم لکھی، جو آج ہندوستان کے بڑے بڑے مشاعروں میں پڑھتے ہیں، زندگی کی تکالیف کو ہنس کر برداشت کرنا ان کا مشغلہ رہا ہے، ظاہر ہے اس کا اثر ان کی شاعری پر بھی ہوا، چاہے وہ غزلیں ہو یا نظمیں یا گیت ہوں، گیتوں میں کئی جگہ انھیں جذبات کا اظہار کیا ہے۔

جانے پہچانے انجانے اپنے گھاؤ
آنگن آنگن جلتی جوالا
سڑک سڑک پتھراؤ
شہیدوں کے سب چہرے زخمی
ننگے سارے بول

یا

بیت گئی رات گھنی
ندیا کے پانی میں پہلی کرن
املی سے طوطے نے پھینکے کنارے
آنگن سے روڈ پر سانجھ سکارا
پیتل کی ٹونٹی سے سرتے ستارے

ندا فاضلی جدید شاعری کا معتبر نام ہے اور جدیدیت صرف ان کی غزلوں اور

نظموں میں دوہوں میں ہی نہیں بلکہ گیتوں میں بھی ہر جگہ نظر آئے گی، نئی نئی علامتیں اور استعاروں کے ساتھ وہ گیتوں میں سماجی بھی ہیں اور رومانی اور جذباتی بھی۔

یہاں ایک گیت جنسیات پر پیش ہے، جو ان کی کتاب ''مورناچ'' میں شامل ہے۔اس گیت میں انھوں نے وصل کی شب کے ایک انوکھے جذبات کی عکاسی کی ہے۔

بڑا مزہ آیا لڑائی میں
ٹوٹ گئی چوڑی کلائی میں
شربت سے میٹھے
دوائی سے کڑوے
سیاں غضب کے شریر
برسائیں تیروں پہ تیر
گھنے اندھیروں میں چوکے نشانہ
دھواں دھواں موسم رضائی میں
بڑا مزہ آیا لڑائی میں
ریشم کے گچھے سا کھلتا سویرا
اجلے ہواؤں کے چہرے
نیلے اندھیرے گلابی اجالے
بادل سنہرے سنہرے
نیا نیا پانی ترائی میں
بڑا مزہ آیا لڑائی میں

گیت چونکہ کیفیات سے متعلق ہوتے ہیں اور کیفیت کو کاغذ پر پیش نہیں کیا جا سکتا ہے، بس محسوس کیا جا سکتا اور لطف اٹھایا جا سکتا ہے۔ یہاں چند گیتوں کے نمونے پیش ہیں۔

نیبو کی پھانکوں سے
نینا رسیلے
بیلا چمیلی سی کھلتی عمر
جھانکے کنویں تال نالے نہریا
چھم چھم سے تھم جائے چلتی بیریا
چکن ڈھلائیں چکدار ٹیلے
نیبو کی پھانکوں سے
گورا بدن جیسے بجتا ریا
سوتے میں اٹھ اٹھ کے بڑے بھیا
ہر روز لوگوں سے ٹکرائے بھیا
دیکھیں تو رستہ نہ چھوڑے مٹیلے
نیبو کی پھانکوں سے نیناں رسیلے

ایک گیت اور دیکھیے:

پانی، سبزہ، پنچھی، بالک، بادل، دھوپ
مائی کے سوروپ
ناگ اٹھے پھن کو لہراتا
جنگل شیر دہاڑے
مور دھنک بن چھم چھم ناچے
بالک رٹے پہاڑے
ندیا تٹ پہ چھلکے گاگر
آنگن پھٹکے سوپ
مائی کے سوروپ

ندی اڑے بادل بن جائے
بادل کھلے تو کھیت
بیج میں پیڑ اور پیڑ میں سورج
سورج اندر ریت
پردہ پیچھے ایک ہی چہرہ
نئے نئے بہروپ
مائی کے سو روپ

ندا فاضلی کے گیتوں میں فضا ہندوستانی ہے، یہیں کی مٹی کی بو باس اور یہیں کی ہوا کی خوشبو ان میں شامل ہے۔

ان کے گیتوں میں ایسی کیفیت موجود ہے، جو انسان اور زمین کے رشتے کو مضبوط کرتی ہے۔ دیکھئے الفاظ، سے، بابا، بیری، شیر، مچھلی، تیل، ریچھ، لوہا، کھیل تماشے، جنگل ۔

خوب سے کا کھیل، دے بابا
خوب سے کا کھیل
میں تیرا بیری تو میرا بیری
بیر نہ کوئی بیچ
تیرا دکھ بھی شیر کا پنجہ
میرا دکھ بھی ریچھ
سارے جنگل ایک سے جنگل
مچھلی لوہا تیل دے بابا
خوب سے کا کھیل
رنگ برنگے نارے

بادل چاند گھٹائیں سورج
کھیل تماشے سارے
تو بھی ہندی، میں بھی ہندی
چاروں جانب جیل دے بابا
خوب ہے کا کھیل

ایک اور گیت دیکھیے، جس میں بالکل اچھوتا خیال اور ایک عجیب سی کیفیت ہے۔

من نہیں لاگے
میری جیون ریشم ریشم
الجھے سارے دھاگے
من نہیں لاگے
پنا کے تاروں میں سرگم
سرگم کے گھیرے میں گیت
گیتوں کی سیما پہ سپنے
سپنوں میں ان دیکھا میت
نیل گگن میں چندا بھٹکے
سورج دن بھر جاگے
الجھے سارے دھاگے
اترے دھند لکے میں سورج
لہروں میں لہرائے آگ
چپ چپ کناروں کے پتھر
ندیا کے ہونٹوں میں جھاگ
من کا پنچھی گم سم بیٹھے

من پریت پر بھاگے
الجھے سارے دھاگے

ندا فاضلی نے گیتوں کو ایک نیا انداز بخشا اور شاعری میں گیتوں کی اہمیت کا احساس دلایا۔ ندا فاضلی چونکہ شروع ہی سے ہندی والوں سے زیادہ جڑے رہے ہیں، اس لئے ان کی پوری شاعری میں ہندی ادب کے گہرے اثرات پائے جاتے ہیں، لیکن انھوں نے اپنی انفرادیت کو ہر صنف میں برقرار رکھا ہے، چاہے وہ گیت ہوں، غزلیں ہوں، نظمیں ہوں یا دوہے ہوں یہی وجہ ہے کہ آج ندا فاضلی ہندی والوں میں اتنے مقبول ہیں، اردو کے ادبی رسائل میں جہاں وہ بڑے اہتمام سے چھپتے ہیں، وہیں ہندی کے معیاری رسائل میں ان کی نظمیں اور دوہے چھپتے ہیں۔

کئی دنوں سے چاند اگا نہ سورج نکلا ہے
جب سے تم پردیس گئے ہو
بہت اندھیرا ہے
رات رات بھر پانی برسے
دھول اڑے دن دن بھر
سو یا دوبے کو پیٹے
گئے ہتھوڑا من پر
بڑھتی بچی راگنی چہرے
میں دیکھوں اٹھ اٹھ کر
نئی صراحی میں پانی
ندیا جیسا ہے
جب سے تم......

دھرم یگ، بھارتی، دھاریکا اور ہندی کے دیگر پرچوں میں ندا فاضلی کی شاعری نے

صرف زیادہ سے زیادہ پڑھی جاتی ہے بلکہ بے حد پسند کی جاتی ہے۔

ندا فاضلی کا اسلوب سادہ اور آسان ہے اور ان کی شاعری کے استعارات اور تشبیہات ہندی شاعری کی تشبیہات اور استعارات سے بہت قریب ہیں یہی وجہ ہے کہ ندا کا کلام اردو رسائل کے ساتھ ساتھ ہندی رسالوں میں بھی شائع ہوتا رہتا ہے۔ دوہے اور گیت تو ہندی کے بہت بڑے رسائل میں اہتمام کے ساتھ ہندی میں چھپے، اور اہم بات یہ ہے کہ گیتوں اور دوہوں میں وہ الگ سے دکھائی دیتے ہیں، یہاں کچھ گیت اور پیش ہیں۔

ایک ایک روپیہ کے سولہ آنے
دو آنے کا مول
بھائی بہن اور پورب پچھم
ماتا پتا بیزار
گھونگھٹ میں گمی خاموشی
دو دھاری تلوار
گھر کی لاج کھڑی دروازے
کب سے سانکل کھول
جانے پہچانے انجانے
اپنے اپنے گھاؤ
آنگن آنگن جلتی ہوا!!
سڑک سڑک پتھراؤ
شبدوں کے چہرے زخمی
ننگے سارے مول
ایک روپیہ کے سولہ آنے
دو آنے کا مول

ندا فاضلی کی ایسی ایسی نظمیں بے شمار ہیں، جو گیت نما ہیں اور کبھی کبھی تو ان کی نظموں میں گیتوں کا رنگ گیتوں کا سا انداز ملتا ہے، جس کا ذکر پہلے باب میں کیا جا چکا ہے، جیسے نیموں کی پھانکوں جیسے نیناں رسیلے گیت کے رنگ کی نظم ہے۔

ندا فاضلی کی اس طرح اور بھی نظمیں ہیں، جو گیت نما ہیں۔

جب سے تم پردیس گئے ہو

بہت اندھیرا ہے

اس گیت نما غزل کے بارے میں پروفیسر عنوان چشتی لکھتے ہیں:

''اس گیت میں ایک برہنی اپنے سوامی کو یاد کرتی ہے چونکہ اس کا سوامی نظروں سے دور ہے، اس لئے ساری دھرتی تاریک ہے۔ وہ بار نے دیپے یہ برہنی لکڑی چیرے۔ چوٹ اس کے دل پر لگتی ہے، اور تنہا اس کے پیا کی موجودگی نے اس کی پیاس کو اور زیادہ بڑھا دیا ہے، اور ابھرتے اس پورے نظم میں خودکلامی یا حسرت کا احساس ہے۔ اسے اپنے دل سے مجبور ہو کر کوئی خارجی عمل نہیں کرتی بلکہ خودکلامی کرتی ہے۔''

ندا فاضلی کی شاعری میں ایک کرب ہے، زندگی کے بڑے بڑے غم کو انھوں نے جذب کر ڈال دیا ہے، لیکن وہ ان کی شاعری میں کہیں نہ کہیں ابھر آتا ہے، چاہے وہ گیت ہوں، غزلیں ہوں یا نظمیں ہوں حالانکہ ان کی طبیعت میں شوخی اور مزاج عاشقانہ ہے۔ ان کی آنکھ ایسی ہے، جس سے کوئی حسین اوجھل نہیں ہو پاتا چاہے وہ اچھا موسم ہو یا کوئی حسین والا ان کے سامنے سے گذر جائے، بس ان کی ذہن میں نقش ہو جاتا ہے۔ دیکھئے

رستے میں وہ ملا تھا، میں بچ کر گذر گیا

اس کی پھٹی قمیص میرے ساتھ ہو گئی

ایک اور گیت دیکھئے

میرے تیرے نام نئے ہیں، درد پرانا ہے

یہ درد پرانا ہے

آنسو ہر گیت کا اپرادھی، ہر آنگن کا چور

کوئی نہ تھامے دامن اس کا، گھومے چاروں اور

گم سم ہے سنسار کچہری، چپ چاپ تھانہ ہے

یہ درد پرانا ہے

جو جی چاہے وہ ہو جائے، کب ایسا ہوتا ہے

شہر شہر پیار لئے، سمجھوتا سوتا ہے

الگ الگ عنوان ہیں لیکن، ایک فسانہ ہے

یہ درد پرانا ہے

ندا فاضلی کے گیتوں میں ایک ایسی کیفیت ہے، ایسا درد ہے، جس میں ہر قاری کے دل کی دھڑکن صاف سنائی دیتی ہے۔ ایک اور گیت پیش ہے، جس میں ایک الگ ہی رنگ دکھائی دیتا ہے۔

جینا ہے تو جینا سیکھو

ادھر ادھر مت بھٹکو

بستی بستی جال بچھے ہیں

خوابوں کے پھندے ہیں

پیٹوں کے بل چلنے والے

صدیوں سے اندھے ہیں

ادھر ادھر مت بھٹکو

ہر عظمت کے پیروں کے نیچے

اوروں کے کندھے ہیں

اوروں کے کندھوں پر چڑھ کر

اپنے کندھے جھٹکو
ادھر ادھر مت بھٹکو
بستی بستی جال بچھے ہیں
قدم قدم پربت پھیلے
کب تک سر پہ چھیلائیں
بہتی بھیڑ جدھر لے جائے
چپ چپ بہتے جاؤ
جب تک ٹھوکر مار نہ کھاؤ
ہنس کا ٹھوکر کھاؤ
لوہے کی زنجیر کے اندر
لوہا بن کے اٹکو
ادھر ادھر مت بھٹکو

ندا فاضلی نے بیشمار موضوعات پر گیت لکھے ہیں، منظر نگاری ہو یا گاؤں کی وادیاں ہوں یا زندگی کی گھٹن ہو، ندا فاضلی نے اپنے گیتوں میں ایک نئی روح پھونک دی ہے۔ جس طرح وہ شاعری کی دیگر اصناف مثلاً نظم، غزل، دوہا نگاری میں ایک منفرد شاعر رہے ہیں، اپنے گیتوں میں بھی وہ منفرد دکھائی دیتے ہیں، ان کے گیتوں کی لے دور سے سنائی دیتی ہے، ندا فاضلی کے ذہن پر شروع سے ہندی ادب کا گہرا اثر رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ گیت اور دوہے جیسے فن میں وہ نمایاں نظر آتے ہیں۔

وہ لکھتے ہیں کہ ڈوبتی ہوئی شام کو ویران پہاڑی کے ایک پرانے مندر میں سورداس کی رادھا کرشن کے یوگ میں ہرے بھرے درختوں سے شکایت کرتی ہے، پجاری کا چمٹا اس کے یوگ کی اداسی سے چاروں طرف پھیلی ہوئی خاموشی پھیلا رہا ہے، ادھر ادھر بھٹکتی ہوئی گائیں سامنے بہتا تالاب سب اس کے یوگ میں شریک ہو جاتے ہیں۔

مدھوبن میں تم کت رہت ہرے
وائے یوگ شیام سندر کے ٹھاڑے کیوں نہ جرے
کون کاج کھڑے رہے بن میں کیوں نہ آگی پڑے

مدھوبن تم کیسے ہرے بھرے ہو، میں تو اپنے شیام کے فراق میں جل رہی ہوں ،اور تم پر کوئی اثر نہیں ہے، میری طرح تم بھی اس آگ میں کھڑے کھڑے کیوں نہیں جل گئے ،تمہارے اس طرح کھڑے رہنے کا کیا کارن ہے ،مدھوبن کے پیڑ بھول خاموشی سے رادھا کے درد کو سنتے ہیں اور شرمندہ ہو کر اداس ہو جاتے ہیں انسان اور فطرت کا یہ معاملہ جس میں چرند پرند پیڑ اور انسان ایک دوسرے کے دکھ درد میں ساجھے دار ہیں۔

ندا فاضلی کو چونکاتا ہے، اس بھجن کا بول دھیمے دھیمے بولنے لگتے ہیں، جو کئی دنوں سے ذہن میں کہیں الجھی ہوئی تھی ، اسے لگتا ہے مس ٹنڈن کے کالج سے اچانک غائب ہو جانے اور رادھا کا شیام سے بچھڑنے میں کوئی ان دیکھا رشتہ اپنی ظاہری شباہتوں کے پیچھے ہر دکھ ایک جیسا ہی ہوتا ہے۔

سورداس کے شبدوں میں:

''ندا فاضلی کو اس سونے پن کی جھلک معلوم ہوتی ہے، جو آہستہ آہستہ اس میں گھر کرتا جا رہا ہے، سورداس کا تعارف کبیر اور میرا سے کراتے ہیں اور وہ ان کی چھلائیں اپنی دھوپ کھانے لگتی ہیں، اس ذہنی قربت نے اس کی زبان کو اور ذہین بنا دیا ہے، کئی مہینوں کی خاموشی کے بعد وہ کئی نظمیں کہتا ہے ایک نظم کے دوہے یوں ہیں۔''

سائے کو چھونا ہے وہ تو نہ
سندرتا کا پیار ہم کو رونا

یہ نظم سندرتا کے عنوان سے ماہنامہ ''سریتا'' کے اردو ایڈیشن کے پہلے شمارے میں شائع ہوئی ہے۔

ندا فاضلی کا شروع شروع میں ہندی کی طرف جانا ایک مجبوری بھی تھا، اور دوسرے اردو زبانوں کی تنگ نظری ہی کی مجبوری تھی۔

ندا فاضلی کو ہندی میں چھپنے سے خاص مدد مل جاتی تھی، جس سے ان کے پینے پلانے کا خرچ بھی نکل آتا تھا اور ہندی والے انھیں نوازتے بھی تھے، ان کی تعریف ہندی کے بڑے بڑے ادیب اور شاعر کرتے تھے، جس سے نہ صرف ان کی حوصلہ افزائی ہوتی تھی بلکہ پیسہ بھی ملتا تھا، اس کے برعکس اردو والے انھیں شاعر تسلیم کرنے کو بھی تیار نہیں تھے، اس کی وجہ ظاہر ہے ندا فاضلی کا شروع سے ہندی نظمیں کہنا اور ایسی نظمیں لکھنا تھا، جو عام اردو والوں کی سمجھ سے باہر ہوتی تھیں، اس سلسلے میں ندا فاضلی کہتے ہیں:

"نظمیں دعا صاحب ریاض صاحب ان کے ساتھ دوسرے مقامی اساتذہ کا مزاق کا موضوع بنتی ہیں گوالیار میں داغ اور نوح کے انداز میں جس طرح کی غزلیں عام ہیں، ان سے ان کے لب ولہجہ کا کوئی تال میل نہیں تھا، مضامین زبان محاورے سب طے شدہ ہیں، ان سے انحراف غلطی میں شمار ہوتا ہے، داغ اور نوح کے اشعار ہندی کے طور پر پیش کئے جاتے ہیں، لیکن ہندی کو یوں کو بدلتے ہوئے لہجے میں قبول کرنے میں کوئی قباحت نہیں ہوتی اردو میں جسے انحراف سمجھا جاتا ہے، وہ دیوناگری کی روایت کا حصہ ہے یہ روایت خسرو محمد قلی قطب شاہ اور ولی کے بعد اردو کے شعوری سطح پر دور ہو جاتی ہے، ہندی کا حلقہ ندا فاضلی کی ہمت افزائی کرتا ہے اور وہ ان سے ذہنی قربت محسوس کرنے لگتا ہے، ان ادیبوں اور شاعروں میں ونود نریش سکسینہ، اوم پربھاکر، مکٹ بہاری سروج، اور بہت سے دوسرے شاعر شامل ہیں، ہندی کی آدھونک جدید کویتا کے ردعمل کے طور پر نوگیت کا آن کر چھوتا ہے، یہ گیت چھایاوادی روایات اور پرگتی وادی بیانیہ گیت سے الگ ہو کر نئے سرے سے اپنا وقت بولیوں کی زندہ روایت سے جوڑتا ہے، اس میں اپدیش اور خیال آرائی کی جگہ رات دن کے نجی

تجربے لمحوں میں بنا ہوا وقت جانی پہچانی جزئیات سے جڑ کر چلتا ہے، ندا ابھی اوم پربھاکر، شوبھ سوم ٹھاکر اور نریش سکسینہ وغیرہ کے ساتھ اس تحریک میں شامل ہے، اس کے گیت بھی اس کے ساتھ دھرم ویر کی روایات میں ''دھرم یگ'' میں نمایاں طور پر شائع ہوئے ہیں ۔ یہی گیت رسم الخط کی تبدیلی کے ساتھ اردو رسائل ''تلاش'' ''تحریک'' اور ''تخلیق'' میں چھپے ہیں، گیتوں کے اس ذہنی زبان کا اثر ندا فاضلی کی نظموں اور غزلوں پر بھی پڑتا ہے''

ہے کہ بدلتی رت یا گیتوں بھرا ساون
اٹھلاتی ہوئی گلیاں شرماتے ہوئے ساون

سچ تو یہ ہے کہ ندا فاضلی نے اردو گیتوں کے لئے ایسی فضا ہموار کی کہ آج اردو گیت ایک الگ سے اردو شاعری کا ایک اہم صنف بن گئی ہے، فلمی دنیا میں رہنے کے بعد بھی ندا نے اپنی شاعری کو ادبی حیثیت سے نہ صرف منوایا ہے بلکہ کہیں بھی کسی بھی صورت میں سمجھوتہ نہیں کیا ہے اور کئی فلمیں انھوں نے اپنی اسی خودداراد بی وقار کو قائم رکھنے کے لئے چھوڑ دیں، وہ چاہتے تو آج فلموں سے ڈھیر ساری دولت کما کر عارضی شہرت حاصل کر سکتے تھے لیکن انھوں نے ادبی وقار کو قائم رکھا، جب کہ بڑے بڑے شاعر اپنی انا کو بالائے طاق رکھ کر دولت کمانے میں مصروف ہیں۔

☆☆☆

ندا فاضلی کی نثر نگاری

ندا فاضلی کی نثر نگاری ملاحظہ فرمایئے اردو ادب میں شاعری کا غلغلہ کچھ زیادہ ہی رہا ہے، لیکن نثر نگاروں نے وہ چاہے افسانے کی شکل ہو ناول ہو یا خطوط ہوں، ہر ایک نے اپنا ایک طرز تحریر کا اچھوتا نمونہ چھوڑا ہے، نثر میں وہ کارہائے نمایاں تو نہیں دکھایا جو اردو غزل کا طرہ امتیاز رہا ہے، پھر بھی نثر لکھی جا رہی ہے۔

اردو نثر کو ترقی پسند تحریک نے اور بھی نئے نئے نام دیئے اور اردو نثر ترقی کرتی رہی، سعادت حسن منٹو، سردار جعفری، فراق گورکھپوری، اور بہت سے نام لئے جا سکتے ہیں، جنھوں نے اردو نثر کو ایک نیا موڑ نیا بانکپن دیا، جدید اردو تحریک نے کوئی اتنا بڑا نثر نگار پیدا نہیں کیا، جن کا ذکر اوپر آچکا ہے، پھر بھی نثر لکھی جا رہی ہے اگر ان میں کوئی منفرد نثر ہمیں نظر آتی ہے تو وہ نام ہے ندا فاضلی کا۔

ندا فاضلی جس طرح اپنی شاعری کی دیگر اصناف یعنی غزل، دوہے، گیت اور نظموں میں ایک خاصی انفرادیت رکھتے ہیں، اسی طرح نثر میں بھی جو لکھا، وہ ادب میں ایک خاص اہمیت کا حامل ہے، ان کے انٹریو، خودنوشت یا شعراء کی کتابوں پر تبصرے اور رائے وغیرہ سب میں ان کی انفرادیت برقرار ہے۔

ندا فاضلی کی نثر نگاری سے متعلق ڈاکٹر گوپی چند نارنگ لکھتے ہیں:

''ندا فاضلی کی شاعری کو تو میں پسند کرتا ہی تھا لیکن گذشتہ سال ''شاعر'' میں ''دیواروں کے بیچ'' ان کی خودنوشت پڑھ کر اس کی نثر کا بھی معترف ہوگیا

ایسی خوبصورت نثر دیکھ کر تعجب میں پڑ گیا کہ ایک اچھا شاعر اچھا نثر نگار بھی ہو سکتا ہے۔

حالانکہ اکثر دیکھنے میں آیا ہے کہ ایک اچھا شاعر اچھی نثر نہیں لکھ سکتا، اچھا نثر نگار اچھی نظم نہیں لکھ سکتا، بہر حال یہ کلیہ تو یہی ہے، مستثنا ہر کلیہ میں موجود ہے، اگر ہم مطالعہ کریں تو شاید صاحب سیف قلم کچھ لوگ مل جائیں گے، حالانکہ ایک تلوار چلانے والا ایک اچھا صاحب قلم نہیں ہو سکتا، اسی طرح ایک صاحب قلم تلوار نہیں چلا سکتا۔''

ندا فاضلی کی نثر ایک ایسی نثر ہے جسے ہم تخلیقی نثر کہہ سکتے ہیں، ایک ایک لفظ ندا فاضلی کے ذہن کی طرح ہوتا ہے، چاہے ان کے دیئے گئے انٹرویو یا کسی کتاب پر تبصرہ ہو یا ان کے خطوط ہوں، ہر چیز میں ایک انوکھی انفرادیت ملے گی۔ ان کے لفظوں میں تہہ داری ہوتی ہے، جس میں معنی کا ایک سمندر ہوتا ہے اور ہمیں تلاش کرنے پر بہت کچھ ملتا ہے اور گذشتہ برس ان کی خودنوشت ''دیواروں کے بیچ'' نے تو بڑے بڑے نقادوں کو بھی چونکا دیا ہے۔

یہاں ان کی خودنوشت ''دیواروں کے بیچ'' سے کچھ اقتباسات پیش ہیں:

''سورج غروب ہو رہا ہے، ایک بے ہوش عورت کے گرد تین چار بچے سہمے ڈرے بیٹھے ہیں، بڑی بہن اٹھ کر لالٹین کی چمنی صاف کر کے اسے روشن کرتی ہے، چاروں طرف چتکبری روشنی پھیل جاتی ہے، سامنے املی کے درخت پر ایک ڈراونا بھوت روز کی طرح آج بھی آ کر بیٹھ گیا ہے۔ لمبے لمبے دانت بڑے بڑے ہاتھ پیر، اس سے شاخیں ہلتی ہیں، تو اس کی گرم سانسیں بہت قریب ہوتی ہیں، دالان میں آتے ہی ڈر لگتا ہے۔''

ندا فاضلی کی نثر نگاری کا اعتراف بڑے بڑے نقادوں نے کیا ہے اور ان کے اسلوب کو پسند کیا ہے۔ پروفیسر مختار شمیم لکھتے ہیں:

''میں ندا فاضلی کی نثر نگاری کا بھی قائل ہوں، جملوں میں ایک طرح کی کاٹ اور الفاظوں کی تراش ان کے بیان کو جہاں معصوم بچے کی مسکراہٹ بخشتی ہے، وہیں کسی شکاری کو جہد افگنی فخر و امتنان بن کر بے اختیار تڑپاتی ہے۔''

ندا فاضلی کی نثر ایک ایسی تخلیقی نثر ہے جو انہیں بہترین نثر نگاروں میں شمار کرنے کے لئے کافی ہے، بیکڑوں شاعر اپنی شاعری میں وہ روانی پیدا نہیں کر پائے جو ندا فاضلی نے اپنی نثر میں پیدا کی ہے، ان کا ایک ایک جملہ معنی خیز ہوتا ہے، ایک ایک لفظ میں معنی کا سمندر پوشیدہ ہوتا ہے، جسے وہ اپنے منفرد انداز اور چھوٹے چھوٹے جملوں میں علامتی انداز اور استعاروں کے ذریعہ ایک اچھوتے اسٹائل میں بیان کرتے ہیں اور یہ مہارت ان کے وسیع مطالعے کی دین ہے، وہ جس موضوع پر لکھتے ہیں، اس کا حق ادا کر دیتے ہیں۔

ڈاکٹر عنوان چشتی لکھتے ہیں:

''ندا فاضلی کی نثر میں ایک خاص ذائقہ اور البیلہ پن ہے اس کا سبب یہ ہے کہ وہ بڑا کا ذہین اور شریر ہے، ندا فاضلی خود پر طنز ہی نہیں کرتا بلکہ بازار میں برہنہ ہونے کی جسارت کر لیتا ہے، اس لئے کبھی کبھی دوسرے کے کپڑے بھی اتروا دیتا ہے، جس پر لوگ منہ بناتے ہیں، یہ سارا کام وہ بول چال کی زبان اور ابھرے لچکدار اور رساتے ہوئے اسلوب میں بیان کرتا ہے۔''

ندا فاضلی کی نثر نے اچانک پورے ادبی حلقوں میں ایک تہلکہ مچا دیا ہے ''دیواروں کے بیچ'' پہلی قسط پڑھنے کے بعد ہی ہر شخص دوسری قسط پڑھنے کے لئے بے چین ہو جاتا تھا ''دیواروں کے بیچ'' جب تک شاعر میں آتی رہی، اس کی ہر قسط موضوع بحث رہی ہے۔ اور یہ کہا جانے لگا کہ اگر ندا فاضلی اسی طرح نثر لکھتے رہے، تو ہندوستان کے بہترین نثر نگاروں میں ان کا نام سرفہرست آئے گا۔ ان کی نثر کا ایک ایک جملہ پر اثر ہوتا ہے اور اس میں نئی تازگی ہوتی ہے، جو بات بڑے بڑے شعرا اپنی شاعری میں پیدا نہیں کر پاتے، وہ ندا فاضلی نے اپنی نثر میں کر دکھایا یوں تو ندا فاضلی کی پہلی نثری کتاب

ملاقاتیں تھی، جو انٹریو پر مشتمل تھی، جس میں ساحر لدھیانوی، علی سردار جعفری، فراق گورکھپوری، اختر الایمان، جاں نثار اختر، کیفی اعظمی، باقر مہدی، قاضی سلیم، خواجہ احمد عباس، علی جواد زیدی سے لئے گئے انٹریو شامل ہیں۔ یہ کتاب اردو میں اپنی نوعیت کی پہلی کتاب تھی، اس سے پہلے اس قسم کے انٹریو کسی نے لئے تھے اور نہ ایسی انوکھی چیز اردو دنیا میں آئی تھی، اس کتاب کے بارے میں ایک مرتبہ کسی شمارے میں ''خامہ بگوش کے قلم سے،، مشفق خواجہ صاحب نے کہا تھا، کہ ندا فاضلی کی یہ کتاب اپنی نوعیت کی الگ کتاب ہے، اس سے پہلے اس طرح کی کوئی کتاب اردو میں دیکھنے کو نہیں ملی۔ اس کتاب میں ندا فاضلی نے ایسے ایسے سوالل کئے ہیں کہ فراق جیسے ہی شاعر تھے جو جواب ٹھیک سے دیتے ہیں، ورنہ آج کے شعراء یا انٹریو لینے والوں کے سوال کچھ ہوتے ہیں اور جوب کچھ، پہلے کچھ سوالوں کے اقتباس پیش کئے جاتے ہیں، سوال سے پہلے ندا فاضلی نے جو تمہید کے طور پر لکھا ہے، وہ ان کی نثر کی زندہ اور انوکھی مثال ہے۔

فراق گورکھپوری سے سوال کرنے سے پہلے چند لائنیں دیکھئے:

''میں سوچتا ہوں چڑیا کتنی معصوم اور بھولی ہوتی ہے۔ فاختہ کتنا خوبصورت پرندہ ہے، اور بلی کے پنچے کتنے تیز ہوتے ہیں اور سانپ کی کینچلی کتنی خوبصورت ہوتی ہے، مگر اس میں چھپا ہوا زہر چڑیا کے پر بلی کے دانت، فاختہ کی چونچ سانپ کی کینچلی اور اس میں چھپا زہر اس طرح کی نثر لکھنے والے صرف ندا فاضلی ہیں۔''

یہ لائن لکھنے کے بعد ندا فاضلی نے شیکسپیر کی مشہور لائن لکھی ہے:

(Life is tale told vy and idiot)

سچ تو یہ ہے کہ ندا فاضلی نے اپنی اس کتاب یعنی ملاقاتیں میں بڑے عجیب عجیب سوال کئے ہیں اور سوال سے پہلے جو انھوں نے ہر شاعر کی شخصیت پر تمہید باندھی ہے، وہ منفرد ہے۔ چاہے وہ ساحر لدھیانوی ہوں یا فراق ہوں سب کے لئے شاعر کے حلیہ سے

لے کر اس کے رہن سہن طور طریقے تک کو بیان کر دیا ہے، مثلاً علی سردار جعفری سے جب وہ ملاقات کے لئے جاتے ہیں تو لکھتے ہیں:

''سردار جعفری سے میں پچھلے ایک سال سے تقریباً ہر روز مل رہا ہوں، وہ جہاں پہلے دن بیٹھے ہوئے لکھ رہے تھے، وہیں اب بھی لکھتے رہتے ہیں، اس کرسی پر بیٹھ کر جوتے کے بند بھی باندھتے ہیں اسی کے پاس کھڑے ہو کر کبھی بالوں میں کنگھا بھی کر لیتے ہیں اور جاتے وقت احتیاطاً اپنی بش شرٹ یا واسکٹ بھی اسی پر لٹکا جاتے ہیں، دو شخص دونوں کے نام سردار جعفری اور ایک کرسی او روہ بھی جب دیکھو بھری ہوئی۔''

ندا فاضلی کی اس کتاب میں ایسے بہت سے اقتباس پیش کیے جا سکتے ہیں، جس سے ندا فاضلی کی انوکھی نثر کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے، مگر طوالت کے خیال سے یہیں ختم کیا جاتا ہے۔

ندا فاضلی نے اپنی منفرد اور تخلیقی نثر سے ادبی دنیا میں ایک بہت بڑا کارنامہ انجام دیا ہے اور اپنی نثری پہلی کتاب ''ملاقاتیں'' سے لے کر ان کی خودنوشت ''دیواروں کے بیچ'' تک لکھ کر ایک نئی تخلیقی نثر کی بنیاد ڈالی ہے، بلاشبہ وہ اپنی منفرد نثر کے خود بانی ہیں۔

☆☆☆

ندا فاضلی کے ترجمے

ترجمے کا فن ایک مشکل فن ہوتا ہے، خاص طور پر شاعری کا ترجمہ تو اور بھی مشکل ہوتا ہے، اس لئے کہ ترجمے میں کسی بھی شاعری کی وہ روح نہیں سماپاتی جو کہ اس کی اصل زبان میں ہوتی ہے مگر ندا فاضلی اس مشکل فن میں بھی ایک مہارت رکھتے ہیں، اس کی وجہ یہ ہے کہ ندا فاضلی کا مطالعہ بہت وسیع ہے، خاص طور پر انگریزی ادب کا بہت گہرا مطالعہ ہے، یوں تو ہندی اور فارسی ادب کا بھی کم نہیں ہے لیکن انگریزی ادب کو تو جیسے حفظ کر لیا ہے۔ ندا فاضلی نے بے شمار چینی اور ہندی شعرا کی نظموں کے ترجمے کئے ہیں اور ان کی شاعری کا بھی انگریزی، ہندی، مراٹھی میں ترجمے ہو چکے ہیں۔ مگر یہاں کچھ ان کے کئے گئے ترجمے پیش ہیں یوشی سا سو گوزو کے ایک جدید شاعر کی نظموں کے ترجمے پیش ہیں، اس شاعر کے بارے میں پہلے ندا فاضلی نے اس کا تعارف کرایا ہے وہ بھی پیش ہے، تاکہ ترجمہ کی گئی نظموں کا پورا لطف اٹھایا جا سکے، ندا فاضلی نے لکھا ہے:

"یوشی سا سو گوزو جاپان کے نئے شاعر ہیں، پیدائش ٹوکیو میں ۱۹۳۱ء میں ہوئی، کئی شعری مجموعوں اور نثری کتابوں کے خالق ہیں، دوسری عالمی جنگ کی ہولناکیوں کے فوری بعد جاپانی ادیبوں کی جو شعری نسل سامنے آئی گوزو اس کے نمائندہ شاعر ہیں۔ "حائل روح" اور "کانٹے دار سورج" کے شاعر گوزو کی شاعری کی لے احتجاجی ہے، ان کی شاعری ماضی و حال کا سیاسی و سماجی جبریت و انسانی مقدر سمجھ کر زندگی کی بے معنویت کا مرثیہ نہیں۔ دہراتی بلکہ اس کے خلاف

اپنے غم وغصہ کا اظہار کرتی ہے، اس غم وغصہ کو کسی نظریے سے تو وابستہ نہیں کیا جا سکتا، لیکن حالات وواقعات سے ان کی انفرادی ہم رشتگی اس میں ہر جگہ نمایاں ہے، یہی وجہ ہے کہ ان کی نظمیں بظاہر بے ربط امیجری ہیں، ایک تاثیر آمیز اندرون ربط پیدا ہو گیا ہے۔ اور جو بدیہی وہیجانی کیفیات میں بھی اپنا شعری توازن نہیں کھوتیں، جاپان کے مشہور نقاد کوئے پی نے اس کے دوسرے مجموعے کی اشاعت پر جو ۱۹۷۰ء میں شائع ہوا تھا، کہا تھا "وزوکی سال لکھتے ہوئے ہو گئے لیکن اس میں ابھی تک ہمیں چونکانے کی قوت باقی ہے۔"

آج کی رات

آج کی رات
میں کسی قدیم عمارت ساز کی طرح سوچ رہا ہوں

یہ ستارے
اور روشنی کی لکیریں
رات کے آسمانوں کے لئے موزوں ہیں
لفظوں کی تلاش
سونے کو سونے سے مٹانے کی آرزو
جھوٹ کو جھوٹ کے قریب لانے کی جستجو

میرے دوست
میں اپنی ہی آگ میں
دھیمے دھیمے جل رہا ہوں
میں کتنا بے خبر ہوں
سرخ شراب کی گہری محراب میں ڈھل
نیلی آنکھوں کی پتلیوں

تیز دانتوں والا پہیہ مسلسل چل رہا ہے
میں اپنے دوست سے الگ ایک بے حس لاش
میز کی دراز میں
چھپی ہوئی میری نظمیں باہر نکلتی ہیں
میں خوابوں کی فکر میں محو
ایک منور لاش جھاڑیوں میں
میں غم زدہ ہوں، نہیں معلوم
ان نظموں میں کون سی تمثیل پوشیدہ ہے
یہ محبت کے خطوط ہیں، جو ابھی تک تحریر نہیں ہوئے
یہ ستارے اور روشن لکیریں
رات کے آسمانوں کے لئے موزوں ہیں
میں چھت پر آسمان کے نیچے ایک پاگل
پورے آکاش کا بوجھ میرے کاندھوں پر
میری دوست
محبت، آسمان پر سلگتی آگ
مکمل جہنم کی تصویر
درخت پر بیل کی طرح
میں آگ کی لپٹوں جیسا
کھلے ہوئے بالوں سے لپٹا ہوا ہوں
میں تیری جستجو میں
میرے چاروں طرف آگ
ایک تازہ کٹا ہوا سر رات کے آسمانوں کو الوداع کہہ رہا ہے

وقت کا دریا بہہ رہا ہے

ایک اور نظم کا اقتباس دیکھیے، جس میں ندا فاضلی نے اپنی ترجمہ نگاری کے فن کو کس طرح اجاگر کیا ہے، ایسا لگتا ہے کہ جاپانی شاعری کی ایسٹڈی ندا فاضلی نے ایسی کی ہے کہ وہ اردو میں ترجمہ ہونے کے بعد اردو شاعری لگتی ہے اور اس کی روح تک رسائی حاصل کرلی ہے، ورنہ ترجمہ کا فن اتنا مشکل ہے کہ شاعری کی اصلی روح اس میں شامل نہیں ہو پاتی۔

خواھش

سنہری تلوار کا رخ سورج کی طرف ہے
ٹھہرے ہوئے ستارے کے آئینے میں
سیبوں کی فصل جھلکتی ہے
ایشیا کے علاقے میں
پرشور ہوائیں چلنے لگیں
صبح ایک پہیے کی طرح بادلوں میں گھوم رہی ہے
میری خواہش ہے
آنکھوں کی بینائی کھو کر سورج بنوں، سیب بنوں
لیکن بالکل ان جیسا نہیں
عورت کے پستان سورج سیب کاغذ
قلم ہے ہی اور خواب بنو
یا ایسی موسیقی میں ڈھلوں
آج کی رات اسپورٹس کار میں
آکاش کا ستارہ، تمہیں سامنے سے
کیا تم اپنے رخساروں پر
گدوا سکتی ہو

تم مجھے کس لیے تکتی ہو

ان نظموں کے علاوہ اور بھی بہت سی نظموں کے ترجمے ہیں، لیکن طوالت کو دیکھتے ہوئے یہاں نظموں کو چھوڑ دیا گیا ہے۔ دیکھیے

تو آنکھیں بند کر کے سوچ

گھٹا گہری ہے، آج کی رات میری ہے

بجلی کے کھمبے نے سوال کو تولا!

پھر دھیمے سے بولا!

برسات اندھیرا تیری فطرت ہے

دوسروں کو سلانا تیری عادت ہے

تو جہاں سے آئی ہے وہیں جا

سمندر آکاش اور بادل تیرا ٹھکانہ ہے

مجھے تو یہیں زندگی بتانا ہے

بھولے بھٹکوں کو راستہ دکھانا ہے

ایک اور نظم ''سورج'' دیکھیے

تمہارے سر پر جو سورج ہے

اور میرا سایہ میرے آگے جا رہا ہے

میں اور سورج اس بحث میں نہیں پڑتے

کہ دونوں میں سے کون

اس سائے کا خالق ہے

میں اپنے سائے سے بھی اس بات پر نہیں الجھتا

کہ ہم دونوں میں

کون کس کا راستہ دکھاتا ہے

ایک اور نظم ''برسات'' کے عنوان پر دیکھئے۔

برسات

برساتی میں ملبوس
ہاتھ میں چھتری لئے
بجلی کے کھمبے کے پاس آ کر بولی
سن ہم جولی

ایک اور انڈونیشیا کے شاعر سپردی دمونو کی نظموں کے ترجمے پیش ہیں۔ یہ وہ شاعر ہیں، جو آج کل یونیورسٹی میں پروفیسر ہیں، انڈونیشیا کے اس شاعر سپردی دمونو کے بارے میں ندا فاضلی ان کی نظموں کے ترجمے سے پہلے جو تعارف پیش کیا ہے، وہ اس طرح ہے:

> ''سپردی دمونو انڈونیشیا کے جدید شاعر ہیں۔ پیدائش ۱۹۴۰ء، آجکل یونیورسٹی میں ادب کے استاد ہیں، چار شعری مجموعوں کے علاوہ کئی تنقیدی کتابیں اور کئی مشہور کتابوں کے ترجمے بھی ان کے نام سے منسوب ہیں۔ جن میں ہمنگ وے کا Old man and thes اور سغیرس کی Ollectad Peoms بھی شامل ہیں۔
>
> سپردی دمونو انڈونیشیا کے ان جدید شعراء میں سے ایک ہیں جنہیں انڈونیشیا کا ایک اہم جدید شاعر تسلیم کیا جاتا ہے، نئے نئے تجربات اور مشاہدات پر ان کی بیشمار مختصر نظمیں ہیں۔''

انہیں چند نظموں کے ترجمے ندا فاضلی نے کئے ہیں، چند نظموں کے اقتباسات پیش ہیں۔

ایک کمرہ میں ہم تین
میں چاقو اور لفظ

چاقو اس وقت چاقو ہوتا ہے
جب اس کے لوہے پر کسی کا خون روتا ہے
وہ چاہے میرا خون ہو
یا لفظ کا

ایک اور نظم کا ترجمہ دیکھئے، جس میں شاعر نے اپنی زندگی کے تجربات اور مشاہدات پر ان کی آنکھوں دیکھا حال کس طرح بیان کیا ہے اور ایک بہترین مترجم کی حیثیت سے ندا فاضلی نے اس کا ترجمہ کس طرح بیان کیا ہے۔

مغرب کی سمت چلتے ہوئے
صبح مغرب کی سمت چلتے ہوئے
میں نے دیکھا
وہی گیس کا غبارہ ہے
جو تمہارے ہاتھ سے چھوٹ گیا تھا
جب تم بچے تھے

ندا فاضلی کے یہ ترجمے اردو کے مختلف رسائل میں چھپ چکے ہیں، ماہنامہ ''شاعر'' بمبئی، سہ ماہی ''قلم'' بمبئی وغیرہ میں۔ یہ ترجمے سہ ماہی ''قلم'' سے لئے گئے ہیں، قلم کے شمارہ نمبر ۱۰ میں ندا فاضلی نے تین شاعروں کی نظموں کے ترجمے دیئے ہیں۔ جن میں ٹوم جانسن، کلاڈ یکے، اور میگل ہرنانڈیز شامل ہیں۔ یہاں ٹوم جانسن کی نظموں کے ترجمے پیش ہیں۔ یہاں ترجمے پیش کرنے سے پیشتر بہتر ہوگا کہ ٹوم جانسن کے بارے میں بتادیا جائے، جس کا تعارف ندا فاضلی نے اس طرح کرایا ہے:

''ٹوم جانسن امریکہ کے متماز جدید شاعر ہیں، پیدائش ۱۹۴۱ء، ابتدا میں وکالت کو ذریعہ معاش بنایا، لیکن کچھ ہی سالوں بعد اسے چھوڑ کے ہمیشہ کے لئے ادب سے وابستہ ہوگئے، کئی یونیورسٹی میں عالمی شاعری کے استاد کی حیثیت

سے کام کیا، ٹوم جانسن اپنی مادری زبان انگریزی کے علاوہ جرمنی، ہسپانوی، اور اطالوی زبانوں کے اچھی اسکالر ہیں۔

اپنی زبان کے مشہور جواں مرگ شاعر ہرنانڈیز جے فرانکو کے، اسپین میں سزائے موت دی گئی تھی کی نظموں کے وہ ترجمے جو کتابی شکل میں شائع ہو چکے ہیں، انگریزی ادبی دنیا میں کافی سراہے گئے ہیں۔ مختلف زبانوں کے کئی شاعروں کے ترجموں کے علاوہ ٹوم جانسن اب تک تین شعری مجموعوں کے خالق بھی ہیں۔ ان میں ایک شعری مجموعہ Foot Bridge Ao India ہے جو ہندوستان میں ان کے قیام کے شعری تاثرات پر مشتمل ہے۔"

یہاں یہ بات واضح کر دینا ضروری ہے کہ ترجمے کا فن اتنا مشکل فن ہوتا ہے کہ اس میں اصل زبان کی وہ چاشنی وہ جذباتی کیفیت ہو بہو پیش کرنا ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے، جیسے ٹوم جانسن کی شاعری کی خوبی یہ ہے کہ وہ بڑی بات کو مختصر الفاظ میں بیان کرنے کا ہنر جانتے ہیں اور فکری احساس کو بھرپور تازگی کے ساتھ بیان کرتے ہیں، تو وہی فضا ترجمے میں آنا یا پیدا کرنا ایک مترجم کے لئے بہت مشکل ہوتا ہے مگر ندا فاضلی نے بڑی خوبی سے انہیں لفظوں کو استعمال کیا ہے اور وہی فضا پیدا کرنے کی کوشش کی ہے جو کہ ٹوم جانسن کی شاعری میں پائی جاتی ہے۔ ایک نظم دیکھئے۔

انتظار

جیسے درختوں کے پتے
بارش کی رم جھم میں تالیاں بجانے کا انتظار کرتے ہیں
یوں ہی جاگے ہوئے راستے
لامعلوم پیش بینی میں
کسی کی روشنی کے جگمگانے کا انتظار کرتے ہیں
یخ زدہ ہواؤں میں

تھوڑی سی حرارت کے لئے
یا ایک اور نظم

پہلے لفظ
میں رات کو بہت مطمئن تھا
تھرمامیٹر زیرو درجہ حرارت میں چوبی اسکیٹ میں
برف کی پری
بھاشا سن رہا تھا
برف کی پر بھاشا ممکن نہ تھی
اپنی سمت اڑتے ہوئے بے آبرو لفظوں کو

ندا فاضلی کے ترجموں میں یہ بات ضرور ہے کہ یہاں بھی ان کا لہجہ نہیں گیا مثلاً ہندی کے خوبصورت لفظوں کا خوبصورت استعمال جو اس نظم میں پری بھاشا کے ادب میں ہے۔ اس طرح ندا فاضلی کا ڈیکلے، میکیل، ہرنا ندیز اور دیگر شعراء کی نظموں کے ترجمے کئے ہیں۔ مگر سب کی نظموں کے ترجمے پیش کرنے میں مقالے کے طویل ہو جانے کا ڈر ہے۔ ندا فاضلی کے شاعری و ذہن تو اپنی جگہ ہے، لیکن یہ بات دیکھنا بہت ضروری ہے کہ وہ جس صنف کو چھوتے ہیں، اس میں اپنی انفرادیت کی ایک نہ مٹنے والی چھاپ چھوڑ دیتے ہیں۔ چاہے وہ ان کے دوہے ہوں یا گیت ہوں، نظمیں ہوں یا غزلیں ہوں، چاہے نثر ہو ہر صنف کے بارے میں الگ الگ بحث کی گئی ہے۔ اسی طرح وہ ایک بہترین مترجم کی حیثیت سے اپنا الگ مقام رکھتے ہیں۔

☆☆☆

سیفی سرونجی اور انتساب پبلیکیشنز کی کتابیں

۱۔ روشن الاؤ شعری مجموعہ Rs. 100/-
۲۔ ایک لمحہ ایک خواب Rs. 100/-
۳۔ ناؤ سمندر موجیں Rs. 150/-
۴۔ ہم رہ گئے اکیلے، کہانیاں
۵۔ ہم بھی ایڈیٹر بن گئے انشائیے
۶۔ سیفی سرونجی، ایک مطالعہ مرتب انیس دہلوی
۷۔ سرونج سے لندن تک سفرنامہ Rs. 100/-
۸۔ جنگل کانٹے دھوپ، دیناگری Rs. 100/-
۹۔ رنگ اور خوشبو، دیوناگری Rs. 50/-
۱۰۔ رنگوں کا امتزاج، مضامین Rs. 100/-
۱۱۔ گنبد خضرا۔ نعتیہ کلام Rs. 50/-
۱۲۔ سیفی سرونجی شخصیت اور فن
مرتبہ محمد توفیق محمد خاں Rs. 150/-
۱۳۔ گاؤں کا مسافر سیفی سرونجی Rs. 150/-
۱۴۔ انور شیخ اور انکے کارنامے Rs. 100/-
۱۵۔ عاصی کاشمیری اور انکی شاعری Rs. 100/-
۱۶۔ انور شیخ ایک مقبول شاعر Rs. 100/-
۱۷۔ گلشن کھنہ، شخصیت اور فن Rs. 100/-
۱۸۔ سیفی سرونجی۔ ایک تنقیدی نظر
از محمد متین ندوی Rs. 150/-
۱۹۔ فن اور فنکار ابراہیم اشک Rs. 150/-
۲۰۔ منفرد گیتوں کا خالق۔ سوہن راہی Rs. 100/-
۲۱۔ لندن کا تیسرا سفر (ہندی) Rs. 150/-
۲۲۔ گوپی چند نارنگ اور اردو تنقید Rs. 150/-
۲۳۔ نئی غزل نئے امکانات Rs. 200/-
۲۴۔ ساحر شیوی کے ادبی کارنامے Rs. 150/-
۲۵۔ اردو کی نئی بستیاں Rs. 200/-
۲۶۔ جدید شاعری کا بھوت Rs. 100/-
۲۷۔ محبتوں کا سفیر۔ دویا ساگر آنند Rs. 200/-
۲۸۔ تنقیدی تاثراتی مضامین Rs. 150/-
۲۹۔ مشاہیر کے خطوط سیفی سرونجی کے نام Rs. 200/-
۳۰۔ نذیر فتح پوری کی ادبی فتوحات
۳۱۔ یہ تو سچا قصہ ہے (سوانح) Rs. 200/-
۳۲۔ خالد محمود شخصیت اور فن Rs. 500/-
۳۳۔ خالد محمود بہ حیثیت انشائیہ نگار Rs. 200/-
۳۴۔ مختار شمیم ایک مہربان دوست Rs. 150/-
۳۵۔ شاہد میر اور ان کا تخلیقی جوہر Rs. 200/-
۳۶۔ خوشبو پھیلے عام
۳۷۔ تو سچا قصہ ہے (ہندی)
۳۸۔ تنقید مجھے نہیں آتی

سہ ماہی انتساب کے خصوصی نمبر

۱۔ بشیر بدر نمبر Rs. 500/-
۲۔ خالد محمود نمبر Rs. 500/-
۳۔ ظفر گورکھپوری نمبر Rs. 250/-
۴۔ ابراہیم اشک نمبر Rs. 100/-
۵۔ ندا فاضلی نمبر Rs. 200/-
۶۔ وقار قاطمی نمبر Rs. 100/-
۷۔ محمد ایوب واقف نمبر Rs. 200/-
۸۔ محمد ممتاز راشد نمبر Rs. 50/-
۹۔ قاضی مشتاق احمد نمبر Rs. 200/-
۱۰۔ پروین شیر نمبر

رابطہ : سہ ماہی ''انتساب''، سیفی سرونجی لائبریری، اور سد بھاؤنا منچ، سرونج (ایم۔ پی۔)
فون نمبر: 07591-253819